[illegible] کتب خانہ عزیزیہ
بالمقابل جنوبی دروازہ جامع مسجد دہلی

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ
بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا

سلسلہ

تقاریر اسلام

کا

پہلا نمبر

اعجاز القرآن

اُس کی حقیقت، اُس کے مدارج، وحی الٰہی کی ضرورت اور اُس کے مراتب بیان
قرآن کریم کا معجزہ اور کلام ربانی اور وحی الٰہی ہونا نہایت پر عظمت تفصیل اور شافی
دلائل سے ثابت کیا گیا ہے

مؤلفہ

معقول ومنقول حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدرس دار العلوم دیوبند دامت برکاتہم

باہتمام مولوی محمد طیب و مولوی محمد طاہر صاحبان سلمہما اللہ

مطبع قاسمی دیوبند میں طبع ہوا

حق تالیف محفوظ ہے

۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اما بعد

نہ کے حالات اسوقت مقتضی ہوئے کہ دار العلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے ایسی تقاریر کا ایک سلہ شروع کیا جائے جن میں اسلام کے عام اصول و قواعد کی تحقیق اور قرآن کریم کی حکیمانہ تعلیم اور اس کی عظمت شان ظاہر کرنیوالی حقائق زیادہ سے زیادہ واضح معقول اور دلنشین پیرایہ میں بیان ہو جائیں اور طلبہ کی ایک جماعت کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ یہاں سے جاکر اپنے ناواقف یا ائیوں کے ایمان کی حفاظت اور منکرین یا مشککین پر خدا کی حجت تمام کر سکیں۔

ی نیت سے اس ناچیز نے چند روز ہوئے کہ ایک سلسلہ بیانات کا شروع کیا اور چونکہ کچھ عرصہ سے یوں کے شور و غوغا نے ملکی سطح میں تلاطم اور اسلامی حلقوں میں حمایت حق کا ہیجان پیدا کر رکھا ہے سلئے ان بیانات میں خصوصیت سے آریہ سماج کے اصول و خیالات مرعی رہے ہیں۔

ہم مباحث سے پہلے میں نے مناسب خیال کیا کہ قرآن کریم کے اعجاز اور کلام الٰہی ہونیکے متعلق مبسوط اور مفصل تقریر کر دی جائے جس کے بعد ایک انصاف پرست اور طالب حق کیلئے یہ ش باقی نہ رہے کہ وہ قرآن کریم کی عظمت و جلالت سے انکار کر سکے یا اس کی روشنی کے کرنے سے روگردانی کرے۔

بحث کے ضمن میں اور بھی کئی مفید اور اہم بحثیں آگئی ہیں۔ اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اعجاز قرآ

کی تحقیق اُسی وقت حدِ تکمیل کو پہنچ سکتی تھی کہ (اعجاز کی بحث ہو یعنی یہ کہ معجزہ کیا چیز ہے؟ اُسکی ضرورت کیا ہے؟

اُس کا وجود فطرۃ (یا نیچر) کے خلاف تو نہیں؟ وہ دلیل نبوۃ کس طرح بن جاتا ہے؟ اور معجزہ جیسے فعلی ہوتا ہے قولی بھی ہوتا ہے؟

پھر یہ بتلانا ہوگا کہ وحی کیا چیز ہے؟ اُس کی ضرورت بندوں کو کیا ہے؟ اس میں تدریج ہو سک ہے یا نہیں؟ قرآن جسے ہم سب سے آخری وحی الٰہی اور کلام ربانی مانتے ہیں اُسکو ہم کیوں معجزہ کہتے ہیں؟ اور کس طرح کلام الٰہی اور وحی ربانی ماننے پر مجبور ہوئے ہیں؟

غرض یہ مضمون جب اپنے نزدیک مکمل ہو گیا اور بقدر کفایت اُسکے سب اطراف و جوانب روشنی میں آگئے تو بعض احباب کی قلمبند کی ہوئی یادداشتوں کو خاکسار نے ایک رسالہ کی صورت میں مرتب کر دیا تاکہ غائبین کے حق میں بھی اس کا نفع عام ہو اور مضمون چھپکر ضیاع سے محفوظ ہو جائے۔ آئندہ بھی اگر خدا نے توفیق دی تو یہی صورت اختیار کی جائیگی۔

جن لوگوں کو ان رسائل کے مطالعہ کا اتفاق ہو اُن سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ رسالہ کو ایک تقریر کی صورت میں دیکھیں اور مہربانی فرما کر اول سے آخر تک پڑھ جائیں۔

کیونکہ مضمون کا پورا لطف اور فائدہ اس کے بغیر حاصل نہ ہوگا۔ بعض مضامین جو بہت ہی خشک فلسفیانہ ہوتے ہیں خواہ اُن کو کتنا ہی سہل عبارت میں ادا کیا جائے لیکن عام لوگوں کو انکے پڑھنے میں پوری دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ایسی معرکۃ الآرا مسائل کی تحقیق میں ناظرین کو اس طرح کے بعض مضامین سے اکتانا نہیں چاہیے بلکہ مؤلف کو اُن کے ترک نہ کر سکنے میں معذور خیال کیجئے۔ اور ہمت کر کے پوری کتاب کو پڑھ جائیے آخر لکھنے والے کی محنت سے تو پڑھنے والے کی محنت زیادہ نہ ہوگی۔

یہی مضمون (اعجاز القرآن) جو آپکے سامنے ہے اہل علم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس کا ابتدائی حصہ کسقدر ضروری ہے جو کسی طرح حذف نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ کہ اُس میں کتنے اہم اور مشکل مسائل کو حل کیا گیا ہے۔

چونکہ اس رسالہ کا موضوع بحث اعجاز القرآن ہے اس لئے اولاً مجھے چند ایسے اصول مبادی کے طور پر بیان کرنا ضروری ہیں جو قرآن کی عظمت اور اُسکے اعجاز کے سمجھنے میں ممد دینے والے ہوں۔ لہذا وہ اگرچہ آپکے نزدیک فی الحال اصل مبحث سے بے تعلق ہوں مگر میں اُن ہی سے اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

اصل اول

کیوں کا سوال کہیں نہ کہیں ختم کرنا ضروری ہے

ملکوتات (سب جگت) میں جو جو واقعات و حوادث پیش آتے ہیں ہر چیز پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ کیوں ہوا؟ مگر ہر شخص کو ناچار ایک جگہ پہنچ کر یہ سوال ختم کرنا پڑیگا۔

تشریح مثلاً لکڑی آگ میں ڈالدی اور آگ نے اُسکو جلا دیا تو سوال ہو سکتا ہے کہ آگ نے اُسکو کیوں جلا دیا؟ پانی آگ پر بہایا اور وہ بجھ گئی تو سوال ہو سکتا ہی کہ پانی نے آگ کو کیوں بجھا دیا؟ کسی نے زہر کھایا اور مر گیا، تو سوال ہو سکتا ہے کہ زہر نے اسکو کیوں مارا؟ آم کے درخت پر صرف آم ہی کیوں لگتا ہی؟ یہ سوالات وہاں بھی پیدا ہو سکتے ہیں جہاں آثار کا صدور ارادہ اور اختیار کے توسط سے نہ ہو جیسے آگ کا جلانا، زہر کا مار ڈالنا، آم کے درخت پر صرف آم ہی کا لگنا، آگ اور آم کے درخت اور زہر کے اختیار سے باہر ہی۔ لیکن اگر کہیں توسط ارادہ و اختیار بھی ہو تو وہاں یہ سوال اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی کافر اسلام لے آئے یا مسلمان مرتد ہو جائے والعیاذ باللہ منہ۔ تو سوال کر سکتے ہیں کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔

غرض کہ ہر چیز کیوں (سوال) کے تحت میں آسکتی ہی۔ مگر دیکھنا یہ ہی کہ کیا کہیں کیوں کا سلسلہ بند بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ آؤ اس کی تفتیش ہم کسی ملحد اور مادہ پرست کو سامنے رکھ کر کریں۔ مثلاً ایک شخص طاعون کی بیماری سے فوت ہوا تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ طاعون کیوں ہوا؟ جواب یہی ملیگا

زہریلے جراثیم کے پھیلنے سے۔ ہم پھر دریافت کرینگے کہ جراثیم کیوں پھیلے؟ کہا جائیگا کہ آب و ہوا کی خرابی سے۔ آب و ہوا کیوں خراب ہوئی؟ بس ابھی یا ایک دو کیوں کا جواب دیکر کیونکا سلسلہ بند ہو جائیگا۔ اور سنئے آگ کیوں جلاتی ہے؟ اسلئے کہ اس میں حرارت مُفرطہ ہے۔ حرارت مُفرطہ آگ میں کیوں ہے؟ آگے کیونکا سلسلہ بند ہوگیا۔ اور اگر ساری دنیا کے فلاسفہ اور حکما بھی جمع ہو جائیں گے تو اس سے آگے کیونکا جواب نہیں دیسکتے۔ جو لوگ فاعل مختار کو چھوڑ کر صرف مادہ کے قائل ہوگئے ہیں اُن سے اور بھی ایک دو باتیں دریافت کرو۔ جن اجزائے مادہ سے آفتاب بن گیا اُن سے چاند کیوں نہیں بنا جن ذرات سے چاند متکوّن ہوا اُن سے بجائے چاند کے سورج کا تکوّن کیوں نہیں ہوا؟ جن مواد سے تاروں کی کروی الشکل ہستیاں موجود ہوئیں ان مواد سے سنگریزے کیوں نہیں بن گئے؟ جن اجزاء سے پاؤں کے تلوے بنائے گئے اُن سے سر کی کھوپری کیوں نہ بنی؟ ہاتھی کی روح میں جو طاقت ہے کہ وہ بڑی بڑی قوی چیزوں کو مسل ڈالتا ہے وہ چیونٹی کی روح میں کیوں نہ آئی؟ اور چیونٹی کی روح جو ذرا سے اشارہ سے صفحہ ہستی سے رخصت ہو جاتی ہے اسقدر کمزور کیوں واقع ہوئی؟ شیر کی روح نے اسقدر قوت کیوں پائی کہ وہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو چیر پھاڑ کر اُن کے پرخچے اڑا دیتا ہے؟ مقناطیس صرف لوہے کو کیوں کھینچتا ہے گھاس کے تنکوں کو کیوں نہیں کھینچتا؟ لوہا اسقدر بھاری اور روئی اتنی ہلکی کیوں ہے؟ وقس علیٰ ہذا۔ غرض کہ ارواح کی قوتوں اور مادہ کی استعدادوں اور خواص میں اسقدر تفاوت کیوں ہے؟

ان ہی چند مثالوں سے واضح ہوگیا کہ ہر چیز کی علّت اور سبب کی تلاش اور کیوں کے جواب کا سلسلہ کوئی ہستی خواہ وہ خدا پرست ہو یا مادہ پرست، ملحد ہو یا موحد زیادہ دور تک جاری نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ کسی نہ کسی درجہ پر یہ سلسلہ طوعاً و کرہاً خواہ مخواہ بند کرنا پڑیگا۔ اور بند کرنے میں ملحد اور موحد دونوں برابر ہیں۔ البتہ فرق اگر ہے تو بند کرنے کے طریقہ میں ہے۔ مادہ پرست سوالات مذکورہ کے جواب میں کہیگا کہ مادہ میں جیسی استعداد تھی ویسی صورت قبول کرلی۔ جب یہ سوال کروگے کہ مادہ میں استعداد کیوں مختلف تھی جواب یہ دیں گے کہ آگے سوال

نہیں ہو سکتا۔ آم کو درخت پر آم لگنے کے متعلق یہ سنو گے کہ اس کی صورت نوعیہ کا اقتضا یہ ہے اسیطرح سنکھیا کا مہلک ہونا بھی اس کی صورت نوعیہ پر محمول ہے۔ دیکھو بڑے بڑے دہریہ جب وہ ہیولی کی استعداد اور مادہ کی قابلیت اور صورت نوعیہ کے اقتضاء پر پہنچے تو آگے بڑھنے سے اُن کی بلند پروازی رک گئی اسیطرح موحد کا حال ہے کہ وہ بھی ایک خاص حد پر پہنچ کر اپنی پرواز کو ختم کر دیتا ہے

"کیوں" کے بند کرنیمیں ملحد اور موحد کا فرق

البتہ اتنا فرق ہے کہ ملحد سے جب سوالات کروگے تو مادہ، صورت نوعیہ، روح کے خواص پر سوالات کو ختم کریگا۔ اور موحد کہیگا کہ جو چیزیں جن خواص و آثار کیساتھ موجود ہیں اللہ جل جلالہ کے علم ازلی محیط میں اُن کا اسی طرح ہونا مناسب تھا۔ اگر مادہ پرست کہے کہ اللہ کے علم محیط میں یہی کیوں مناسب تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تم نے مادہ کی استعداد کے سامنے سر جھکا دیا تو اس میں کیا عیب ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے علم کے سامنے سر جھکائیں؟ اگر تم صورت نوعیہ اور روح و مادہ کے سامنے سجدہ کرکے اور عاجز ہو کر سوالات کے سلسلہ کو بند کرنے کا حق رکھتے ہو تو ایک موحد کو کون روک سکتا ہے کہ وہ اپنے پیمانہ فہم کو تنگ اور قوۃ ادراک کو علم الٰہی کی روبرو حقیر و ناچیز سمجھکر اُس خدائے قدوس و برتر کے سامنے سجدہ کرے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز سجدہ کرتی ہے۔ جہاں تم نے سوال کا سلسلہ ختم کر دیا روح کی قوت اور مادہ کی استعداد پر وہاں میں کہونگا کہ اس کو منتہی کرو اللہ جل جلالہ کے علم محیط ازلی پر جس طرح مادہ اور روح کے خواص کو تم ازلی کہتے ہو جس میں ارادہ اور اختیار کو کوئی دخل نہیں، اسی طرح خیال کرلو کہ اللہ تعالےٰ کا علم محیط بھی ہمارے نزدیک بلکہ تمام اہل ملل کے نزدیک ازلی ہے۔ خدا کو یہ اختیار نہیں کہ وہ علم کو ایک منٹ کے لئے اپنے سے جدا کرکے جاہل رہجائے (معاذ اللہ) خلاصہ یہ کہ خدا یہ اختیار نہیں رکھتا کہ وہ اپنے کو خدا نہ رہنے دے۔

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی

اور ہر چیز کی انتہا تیرے رب کی طرف ہے۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ ۝	اُس کے کاموں کی نسبت سوال نہیں کیا جاسکتا ہاں بندوں سے بازپرس ہو سکتی ہے۔
وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۝	اور تم کو تو صرف ایک ذرا سا علم دیا گیا ہے۔
سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۝	پاک ہے تو (اے پروردگار) جس قدر تو نے بتلا دیا اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک تو ہی ہے جاننے والا اور حکمت والا
وفی الحدیث الصحیح فَلْیَنْتَهِ وَلْیَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ	(جب خدا تک سوال کا سلسلہ پہنچے) تو چاہیے کہ آدمی رک جائے اور اللہ کی پناہ ڈھونڈے۔

اصل دوم

قدرۃ اور عادۃ میں فرق عادۃ کے مراتب خرق عادت کی حقیقت

جو لوگ خدا کی ہستی اور اس کے وجود کے قائل ہیں ناچار ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ کی ایک قدرت ہے اور ایک ارادہ اور ایک اس کی عادت ہے اور یہ تینوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔

قدرت اور عادت میں بسا اوقات التباس ہو جاتا ہے۔ مثلاً عام طور پر ایسے امور کے متعلق جو سلسلہ اسباب و مسببات کے خلاف واقع ہوں کہدیا جاتا ہے کہ یہ امر قانونِ قدرت کے خلاف ہے اور اہل الحاد اسی بہانہ سے بہت سے صحیح مسائل کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہو کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ یہ امر قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ یہ لوگ اس لفظ کا غلط استعمال کرتے ہیں۔

اس وقت میرا روئے سخن دہریوں کی طرف نہیں بلکہ آریوں کی طرف ہے اور آریہ بھی قانون قدرت کا لفظ بہت استعمال کیا کرتے ہیں لیکن خود بھی پرمیشور کو "سروشکتیمان" (قادر مطلق) مانتے ہیں۔ جیسا کہ ہم خدا کو قادر مطلق مانتے ہیں پس اگر وہ واقعی سروشکتیمان اور قادر مطلق ہے تو اس کی قدرت میں یقیناً یہ داخل ہے کہ سبب کو بدون مسبب کے اور مسبب کو بدون سبب کے پیدا کر دے۔ مثلاً آگ موجود ہو مگر نہ جلاوے۔ یا کوئی چیز جل جاوے مگر آگ موجود نہ ہو۔ یا مثلاً

ہم قادر مطلق کی عادت یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ عورت کے رحم سے نکلتا ہے اور پھر بتدریج نشو و نما پاتا ہے چنانچہ کسی نے نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی جوان انسان آسمان سے اترا ہو یا زمین سے اُگ آیا ہو مگر اس عادۂ مستمرہ کے خلاف ماں کے رحم اور نطفہ کے توسط کے بدون انسان کو پیدا کرنا بھی اُس سروشکتیمان کی قدرت میں داخل ہے۔ کیونکہ ان کا مذہب ہے کہ لیل و نہار کیطرح یہ عالم بھی فنا ہو کر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور جیسے رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے اسیطرح عالم کا سلسلۂ فنا و بقا یکے بعد دیگرے جاری ہے اور عالم کے فنا کے زمانہ کو وہ "پرلے" کا زمانہ کہتے ہیں اور اسوقت میں اُن کے خیال کے موافق سارا عالم فنا ہو جاتا ہے اور سب کچھ مٹ مٹا کر خدا کی ذات میں سما جاتا ہے اور جیسا کہ رگوید میں تصریح ہے صرف پر برہم کی سامرتھ (یعنی خدا کی قدرت) باقی رہجاتی باقی سب کچھ نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ایک مدت دراز تک اسیطرح عالم فنا میں پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے پھر پیدا ہو جاتا ہے۔

اب دنیا کا جو دور چل رہا ہے اس کا حساب سوامی دیانند نے نہ معلوم کس بہی کھاتہ سے لگا کر یہ کہا ہے کہ "ایک ارب چھیانوے کروڑ کچھ لاکھ کچھ ہزار برس سے یہ دنیا موجود ہے۔ اس سے پہلے غیر متناہی مرتبہ دنیا مٹتی اور پیدا ہوتی چلی آئی ہے۔ اور موجودہ دور بھی اپنے وقت پر جب خدا چاہے گا فنا ہو جائیگا۔"

اس عقیدہ کا رد اسوقت مقصود نہیں۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ جب دنیا پرلے کے بعد نئے سرے سے پیدا ہوتی ہے تو مختلف مخلوقات خصوصاً انسان کہاں سے آتے ہیں؟

سوامی دیانند لکھتے ہیں کہ "پرلے کے بعد جو انسان پیدا ہوتے ہیں اُن کی پیدائش کی کیفیت متعارف طریقہ سے بالکل علیحدہ ہے۔ یعنی ہزاروں انسان بغیر ماں باپ کے جوان محض خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ سے بدون متعارف سلسلہ اسباب طبیعیہ کے بن جاتے ہیں"۔ اب جو مذہب یہ کہتا ہے وہ مذہب قطعاً حق نہیں رکھتا کہ وہ اس کے بعد سروشکتیمان کو اس ظاہری سلسلۂ اسباب میں ایسا جکڑ بند کر دے کہ خواہ کیسی ہی حکمت اور مصلحت کا اقتضا ہو مگر وہ ایک منٹ

کے لئے ان اسباب کے سلسلہ سے الگ ہو کر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے بھی مجبور اور عاجز ٹھہرے۔

جب ان کے اعتراف کے موافق پرلے کے بعد اس عادۃ مستمرہ کے برخلاف غیر متناہی دفعہ ایسا ہو چکا ہے اور ہوتا رہیگا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو خدا اب سے ایک ارب سال پہلے ہر پرلے کے بعد قادر تھا کہ بدون ماں باپ کے انسان کو پیدا اور بدون اسباب کے مسببات کو موجود کردی اب اس کی قدرت کو کس چیز نے سلب کر لیا کہ ایک یا دو ارب سال کے بعد ایسا نہ کر سکے۔

معلوم ہوا کہ خرقِ عادت یعنی کبھی کبھی سلسلۂ اسباب سے علیحدہ ہو کر محض وسیع قدرت کے اظہار کے طور پر کوئی کام کرنا اس کی قدرت کے خلاف نہیں۔ ہاں عام عادت اور معمول کے خلاف ہوگا لہٰذا اس کو قانونِ عادت کے خلاف کہنا صحیح ہو تو ہو مگر قانونِ قدرت کے خلاف قرار دینا اس لفظ کا غلط استعمال اور مغالطہ دینے والی تعبیر ہے۔

مثلاً اہل اسلام کے عقیدہ کے موافق ابراہیم خلیل اللہ کو آگ میں ڈالا گیا اور وہ نہ جلے تو خدا کی اس عام عادت کے تو خلاف ہوا جو آگ کے متعلق ہے کہ وہ جلانے کا سبب ہے لیکن قدرت کے خلاف نہ ہوگا جس نے ہی اس میں یہ خاصۂ احراق ودیعت کیا ہے۔

آریوں کے چار رشیوں کے علاوہ کسی اور سے خدا کا ہمکلام ہونا قدرت کے خلاف نہیں البتہ عادت کے خلاف ہے

آریہ کہتے ہیں کہ ہر پرلے کے بعد چار ویدوں کا الہام چار معین اشخاص کو ہوتا ہے جن کے نام بھی لکھے ہیں۔ وایو۔ اگنی۔ انگرا۔ ادیتہ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چار رشی ہیں گو تاریخ ایسے ممتاز انسانوں کا کوئی پتہ نہیں دیتی۔ اور نہ اُن کی کوئی سوانح بتلا سکتی ہے۔ بلکہ ان کو چار انسان بتانا بھی سوامی دیانند کی کوشش کا نتیجہ ہے جو ان ہی کے دائرۂ اثر تک محدود ہے۔ دوسرے بڑے بڑے فرقے ہنود کے اس کی تشریح دوسری طرح پر کرتے ہیں تاہم مجھے اسوقت اس سے

بحث نہیں ۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ آریہ سماج کے نزدیک ہر پرلے کے بعد ان ہی چار رشیوں پر چار ویدوں کا الہام جگ کی ابتدا میں ہوتا ہے ۔ بعد میں کوئی کتاب کسی پر نہیں اُترتی اور ہر پرلے کے بعد وہی چار وید اُترتے ہیں کہ جو پہلے اُتر چکے ہیں ان میں بھی تغیر اور تبدل نہیں ہو سکتا ۔ میں کہتا ہوں کہ حق تعالےٰ ان ہی چار رشیوں سے ابتدائے آفرینش میں کلام کرتا ہے اور کسی سے نہیں کرتا ۔ گویا خدا کا بندوں سے ہمکلام ہونا اس کی عام عادت نہیں بلکہ خاص عادت ہے جو خاص زمانہ میں مخصوص بندوں کی نسبت ظاہر ہوتی ہے حالانکہ خدا اس سے مجبور اور عاجز نہیں کہ اگر وہ چاہے تو کسی اور سے بھی کسی وقت کلام کرلے تو مجھے اسوقت یہ کہنا ہے کہ خود آریوں کے اصول کے موافق بھی دو چیزیں الگ الگ ہوئیں ۔ ایک قدرت اور ایک عادت ۔ اور یہ کہ عادت کے خلاف کوئی کام کرنا بھی قدرت سے خارج نہیں ہے پس اسباب کے مسبب کا پیدا کرنا خدا کی عادت ہے ۔ اور بلا سبب کے مسبب بنا دینا قدرۃ کا کام ہے اسباب کا سارا سلسلہ قدرۃ کا بنایا ہوا ہے ۔ نہ یہ کہ قدرت اسباب کی بنائی ہوئی ہے اور اسلئے قدرت تو اسباب پر حاکم ہوگی لیکن اسباب معاذ اللہ قدرت کے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ڈال سکتے

قرآن کریم نے بھی قدرت اور عادت میں فرق کیا ہے ۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ

یہ تو اللہ کی قدرت اور ارادہ کا تفاوت ہوا ۔ اب عادۃ کا بیان سنئے ۔ فرماتے ہیں :۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ	یہی فطرۃ (نیچر) ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کے (قانون) پیدائش کو کوئی بدل نہیں سکتا ۔
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًا	خدا کی عادت میں تم ہرگز کوئی تبدیل تغیر نہ پاؤگے
سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ	یہ خدا کی عادت ہے جو اپنے بندوں کے متعلق پہلے سے چلی آتی ہے

یہ غیر متبدل سنت اللہ عادۃ اللہ ہے ۔ پس معلوم ہوا کہ عادت اور قدرت میں فرق ہے ۔ اسکی

مثال یہ ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ عمامہ باندھنے کا عادی ہے۔ یا کوئی ہمیشہ چاول کھاتا ہے۔ یہ تو اس کی عادت ہوگی۔ مگر باوجود اس کے بھی وہ ٹوپی اوڑھنے یا روٹی کھانے پر قادر ہے یہ اسی کا نام قدرت ہے۔ ہر انسان اپنے اندر اس بات کو پاتا ہے مثلاً لڑکا اپنے ناتوان باپ کو مار سکتا ہے (یہ اس کی قدرت ہے) مگر نہیں مارتا۔ یہ اس کی عادت ہے۔

عادت عامہ و خاصہ

ہاں عادت میں بھی تفصیل ہے۔ ایک عادت عام غیر موقت اور مستمر ہوتی ہے۔ ایسی عادت سے ہر خاص و عام واقف ہو جاتا ہے۔ اسی کو نقل کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہوا، اور اساتذہ کی عام عادت دیکھی تو وہ یہاں سے جا کر اسی عادت کو نقل کریگا۔ جو مدت قیام میں روزمرہ مشاہدہ کرتا رہا ہے۔ دوسری عادت موقت یعنی خاص وقت کیساتھ مخصوص ہوتی ہے اس کو عادت خاصہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً کوئی ہمیشہ روٹی کھاتا ہے مگر عید کے روز ہمیشہ چاول کھایا کرتا ہے پس جس شخص نے اس کو عید کے روز چاول کھاتے نہ دیکھا ہو وہ کہیگا کہ چاول کھانا اس کی عادت نہیں مگر جس نے دس بیس مرتبہ عید کی عادت بھی دیکھی ہے وہ کہیگا کہ روٹی کی طرح چاول کھانا بھی اس کی عادت میں داخل ہے۔ ایک عام مستمر عادت ہے، دوسری خاص موقت۔ دونوں اپنے اپنے خیال اور تجربہ کے موافق درست کہتے ہیں مگر دوسرے کا کہنا مطابق واقعہ ہے۔ اس لئے کہ اس کو اس شخص کے تمام زمانہ پر نظر ہے۔ وہ جیسا عادتِ عامہ سے واقف ہے ویسا ہی عادت خاصہ سے بھی آگاہ ہے۔

یاد رکھو! جس کا نام ہم **معجزہ** رکھتے ہیں وہ بھی ایک فعل اللہ تعالیٰ کا ہے جو اس کی عام عادت کے گو خلاف ہو مگر عادتِ خاصہ کے خلاف نہیں ہوتا، بلکہ اس کے مطابق اور موافق ہوتا ہے کیونکہ خاص خاص اوقات اور خاص خاص مصلحتوں کے وقت عام عادت کے توسط کو چھوڑ کر محض قدرت سے خوارق اور معجزات کا ظاہر کرنا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص عادت ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو ہم نہایت متحمل مزاج، حلیم الطبع سمجھتے ہیں۔ کہ ہزار گالیاں سننے پر بھی

غصہ نہیں آتا۔ مگر اس کی طبیعت میں یہ بھی ہے کہ مذہب پر اگر کوئی حملہ کرے تو باوجود اسقدر بردباری کے غصہ سے بیتاب ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کیا یہ اس کی عادت نہیں سمجھی جائیگی

اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ اسباب سے مسببات کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی اس کی عادت ہے کہ جب اپنے مقربین (انبیاء کرام) کی تصدیق کرانا ہوتی ہے تو ان کے ہاتھوں پر وہ علامات ظاہر کرتا ہے جس سے لوگ سمجھیں کہ بیشک یہ اُسکے مقربین اور معتمد خاص ہیں جن کے دعویٰ کی تصدیق کیلئے وہ خلاف معمول چیزیں پیش کر کے ساری مخلوقات کو اس کی مثل لانے سے عاجز کر دیتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے عقل اور فطرۃ کا اقتضا بھی یہی ہے کہ خدا اپنے خاص بندوں کیساتھ وہ معاملہ کرے جو دوسروں سے نہ کرے۔ کیا ایک گاؤں کے مکھیا یا نمبردار کے کہنے سے وائسرائے وہ کام کر سکتا ہے جو کہ ایک صوبہ کے گورنر کے کہنے سے کرتا ہے؟ ماں، باپ، بیوی، احباب، اقارب، حکام، رعایا غرض ہر ایک کیساتھ انسان کا معاملہ اور اس کی عادت جداگانہ ہوتی ہے جو ثابت کرتی ہے کہ یہ حاکم ہے یہ محکوم ہے، اور یہ باپ ہے، یہ لاڈلا بیٹا ہے۔ بسا اوقات جو بے تکلفی یا خلاف طبع امور کا تحمل آدمی اپنے مخلصوں اور دوستوں کی رعایت سے کر لیتا ہے وہ ہرگز ساری دنیا کے دباؤ سے نہیں کر سکتا۔ ایک استاذ کا خاص خاص شاگردوں کیساتھ جو معاملہ ہوتا ہے وہ تمام طلبہ سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں میں عام عادت سے علیحدہ معاملہ کرنا ہی قرین قیاس اور عقل و فطرۃ کے موافق ہے تاکہ قریب کا قریب اور بعید کا بعید ہونا لوگوں پر واضح ہو جائے اس امر کو ملحوظ رکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ معجزہ فطرۃ کا مقتضا ہے۔ اس کے مخالف کیونکر ہو سکتا ہے بلکہ اگر معجزات ظاہر نہ ہوں تو یہ حکمت کے خلاف ہوگا، سفاہت ہوگی ع گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔ جو لوگ خدا کے یہاں وجیہ ہیں اپنی جان، اپنی آبرو ہتھیلی پر رکھکر خدا کیلئے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور خدا ہی اُن سے یہ دعویٰ کراتا ہے کہ آج تمہاری سب کی نجات میرے اتباع میں منحصر ہے۔ ضروری ہے کہ اُن کی وجہ سے عام عادت سے بالاتر کارنامے خدا کی قدرت کے ظاہر ہوں جو کہ تمام دنیا کو اپنی نظیر پیش کرنے سے تھکا دیں۔ اور تمام مخلوق کو عاجز کر دیں

یہی معنی ہیں معجزہ کے۔ یاد رکھئے کہ معجزہ خدا کا فعل ہوتا ہے، اس کو نبی کا فعل سمجھنا سخت غلطی ہے۔

معجزہ خدا کا فعل اور اس کی خاص عادت ہے

معجزہ قانون عادت عامہ کے خلاف اور عادت خاصہ کے موافق اللہ کا ایک فعل ہے جو کہ تمام مخلوق کو تھکا دینے اور عاجز کر دینے والا ہوتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ سچے مدعی نبوت کا وہ رتبہ تمام جہان پر واضح کر دے جو کہ اس کے یہاں اُس کو حاصل ہے اور یہی حکمت کا اقتضا بھی ہے۔ کیا میں اپنے بیٹے کیساتھ جو عادت برتونگا وہی ایک عامی آدمی کیساتھ بھی کرونگا؟ نہیں! بلکہ جیسے تعلقات ہوتے ہیں ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اللہ کیساتھ بھی جن کا جیسا تعلق ہو، ویسا ہی اُدھر سے معاملہ اور برتاؤ بھی ہو۔

یہی معجزہ کی حقیقت ہی جس سے آج کل کے مادہ پرستوں کو اسقدر گھبرانے اور وحشت کھانیکی ضرورت نہیں

ہم نے خدا کو اس کے کاموں سے پہچانا ہے

اس کے بعد ہمیں سوچنا چاہئے کہ وہ کیا چیز ہے جس نے ہم کو خدا کے ماننے پر مجبور کیا؟

(جواب) سو یہ بات ظاہر ہے کہ جب ہم مکونات میں مختلف افعال و آثار دیکھتے ہیں تو بعض انمیں سے ایسے ہیں جنکو ہم کسی سبب کیطرف منسوب کر سکتے ہیں۔ مثلاً بیمار نے دوا پی، اچھا ہو گیا۔ یہ صحت یابی دوا کی طرف منسوب ہو گئی۔ چھت گری اور اس کے نیچے کوئی دب کر مر گیا، بجلی گری اور کوئی شخص جل گیا۔ اور بعض ایسے ہیں جن کو کسی سبب کیطرف منسوب نہیں کر سکتے۔ جیسے کسی پر بجلی گری مگر نہیں مرا، یا چھت گری مگر وہ زندہ نکلا۔ اس قسم کے واقعات کو کسی سبب کی طرف محمول نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ محض خدا کی قدرت سے ایسا ہوا۔ کیونکہ یہاں بظاہر اسباب کا سلسلہ اُس واقعہ کے مخالف تھا۔ چاند سورج کو گہن لگتا ہے اس کا سبب بیان کیا جاتا ہے۔ بارش برستی ہے اس کا سبب بیان کرتے ہیں۔ لیکن اسباب کا سلسلہ ضرور کہیں نہ کہیں مجبوراً بند کیا جاتا ہے۔ اور وہاں پہنچکر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ چیز من قدرتی

ہیں۔ غرض قدرتی چیزیں وہ کہلاتی ہیں جن کا بنانا تمام مخلوق کی قدرت سے باہر ہو اور جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک قادر مطلق کا اقرار کرنا پڑتا ہے اسی لیے حق تعالیٰ نے ایسی اشیاء کے وجود سے اپنے وجود پر استدلال فرمایا ہے۔ قرآن عزیز میں فرماتے ہیں:-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ
بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ
مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا
مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۝

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کو ادل بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) سمندروں میں لیکر چلتے ہیں اور مینہ میں جو اللہ آسمان سے برساتا پھر اسکے ذریعے زمین کو اسکے مرے پیچھے دوبارہ زندہ کرتا ہے۔ اور ہر قسم کے جانوروں میں جو خدا نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر پھیرنے میں اور بادلوں میں جو خدا کے حکم سے آسمان و زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں (غرض ان سب چیزوں میں) اُن لوگوں کیلئے جو عقل رکھتے ہیں بہتیری نشانیاں موجود ہیں۔

آسمان اور جو ستارات اس میں ہیں جیسے چاند سورج وغیرہ۔ ان سب کا وجود قدرتی ہے، انکی پیدائش کو کسی مخلوق کا فعل نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اسکے مثل بنانے کا حوصلہ نہیں کرسکتی۔

زمین ہے کہ جس سے ہر قسم کی غذائیں اور رنگ برنگ کے پھول پھل نکلتے ہیں۔ کسی کی طاقت نہیں کہ ایک ٹکڑہ اس جیسی زمین کا بنادے، سورج ایک معین اور مضبوط نظام کے ماتحت ہمیشہ دن کو نکلتا ہے، شام کو غروب ہو جاتا ہے۔ کسی کی کیا طاقت ہے کہ اسکو ایک منٹ یا ایک سکنڈ کیلئے روک لے۔ ہوا ہے کہ اسپر کسی کا قابو نہیں، انسان چاہتا ہے کہ پچھوا چلے مگر پروا چلتی ہے۔ سارا جہان ملکر پانچ منٹ کیلئے بھی پچھوا نہیں چلا سکتا۔ پانی کے بھرے ہوئے بادل کڑکتے اور گرجتے ہوئے نکل جاتے ہیں مگر کسی کو اختیار نہیں کہ بارش حاصل کرسکے۔ زمین و آسمان کے درمیان بادل لٹکا ہوا ہے کسی کی طاقت نہیں کہ دو قطرے لے سکے، اور جب برستا ہے تو کسی کی قدرت نہیں کہ روک سکے۔ جب ان امور کو انسان دیکھتا ہے اور عاجز ہو جاتا ہے تو قدرت کو ماننا پڑتا ہے۔ طوفان خیز سمندر

ہیں جہازوں کا چلنا، ہواؤں کا ادل بدل یہ سب چیزیں کسی کے قبضہ میں نہیں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝

اور سورج ہے کہ چلا جا رہا ہے اپنے ٹھکانے کیطرف یہ اندازہ ہے زبردست حکیم کا باندھا ہوا اور چاند ہے کہ مقرر کردی ہیں ہمنے اُس کی منزلیں یہانتک کہ پھر لوٹ کر رہ جاتا ہے کھجور کی پرانی ٹہنی کیطرح۔ نہ تو سورج کو یہ لائق ہے کہ وہ جا پکڑے چاند کو اور نہ رات کی مجال ہے کہ وہ آجائے دن ختم ہونے سے پہلے اور ہر سیارہ پڑا اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے۔

یہ سب اس لئے ذکر کیا گیا کہ آپ سمجھ لیں کہ خدائی کام اور انسانی کاموں میں کسطرح تمیز ہوتی ہے۔ خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ اس جیسا کرنے سے سب مخلوق عاجز ہو۔ ازل و ابد کے انسانوں کو بلاؤ لیکن کوئی نہ کر سکے۔

یہی استدلال ابراہیم علیہ السلام نے بھی کیا تھا۔ پہلے حیات اور ممات کے متعلق سوال کیا جب اس میں مخاطب (نمرود) کی عباوت دیکھی تو فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ میرا رب ایک قاعدہ سے، ایک ضابطہ سے شمس کو چلاتا ہے۔ خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ دنیا میں اس کا مقابلہ کوئی طاقت نہ کر سکے۔

خدائی کام کیطرح خدائی کلام کو بھی سمجھنا چاہئے

ٹھیک اسی طرح خدائی کلام وہ ہے کہ ساری دنیا اس جیسا کلام بنانے سے عاجز اور درماندہ ہو۔ ساری دنیا کو للکارا جائے، غیرتیں دلائی جائیں، مقابلہ کیلئے کھڑا کیا جائے اور لوگ چاہیں کہ کسیطرح یہ روشنی بجھ جائے مگر پھر بھی ویسا کلام بنا کر نہ لاسکیں تو ہم سمجھیں گے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح خدائی کاموں کو بندوں کے کاموں سے الگ کرکے پہچان سکتے ہیں کیونکہ ان دونوں میں بیّن اور واضح فرق ہوتا ہے۔ گلاب خدا کا بنایا ہوا ہے اب تم بھی کاغذ کے پھول بناتے ہو۔ مگر تمہارے پھول پر پانی کا ایک چھینٹا پڑ جاتا ہے تو ساری صنعت کا سارا پول کھل جاتا ہے۔ لیکن قدرتی پھول پر پانی گرتا ہے تو اس میں

اور زیادہ صفائی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

معجزہ کوئی فن نہیں

بلا شبہہ خدائی کام اور بندوں کے کام میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ خدائی کام کی نقل بندہ اتارتا ہے۔ لیکن عاقل کو کبھی التباس بھی نہیں ہو سکتا۔ انسان جانداروں، درختوں، پھولوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے۔ مگر ایک مچھلی کی آنکھ ایک مکھی کا پر، ایک مچھر کی ٹانگ، بلکہ ایک جو کا دانہ تمام عالم ملکر بھی نہیں بنا سکتا۔ لاکھوں مجسمے، کروڑوں بیل بوٹے دنیا کے صناع بناتے ہیں۔ مگر مچھر کا ایک پر بنانے سے بالکل عاجز ہیں۔

لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ	کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ پیدا کرلیں ایک مکھی کو اگرچہ وہ سب اس کام کیلئے اکٹھے ہوجاویں
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَہَا۔	اللہ محجوب نہیں ہوتا اس سے کہ بیان کرے مثال مچھر کی اور اس سے بھی زیادہ کمتر اور حقیر چیز کی۔

اسی کا نام خدائی فعل ہے۔ اور جب ایسا فعل بدون اُن اسباب کے جو کہ اُس کے تکوّن کے لئے متعارف ہیں۔ کسی مدعی نبوت کے ہاتھوں پر ظاہر ہو تو اسی کا نام معجزہ ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ جنس افعال سے ہو یا جنس اقوال سے۔ اور جب کہ یہ ثابت ہوا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو بدون تعاطی اسباب کے ظہور پذیر ہوتا ہے، تو دوسرے خدائی کاموں کی طرح اس میں بھی کسی صانع کی صنعت کو دخل نہیں ہو سکیگا۔ پس تنجیم، کہانت، مسمریزم، سحر، شعبدہ کیطرح معجزہ کوئی فن نہیں ہے جو کہ تعلیم و تعلّم سے حاصل ہوتا ہو۔ یہ فنون سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن معجزہ میں نہ تعلیم و تعلّم ہے۔ نہ انبیا کا کچھ اختیار اس میں چلتا ہے نہ معجزہ صادر کرنے کا کوئی خاص ضابطہ اور قاعدہ ان کو معلوم ہے کہ جب چاہیں ویسا ہی عمل کرکے ویسا ہی معجزہ دکھلا دیا کریں۔ بلکہ جس طرح ہم قلم لیکر لکھتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلم لکھتا ہے اور فی الحقیقت اس کو لکھنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہی صورت معجزہ کی بھی ہے۔ ایسا نہیں کہ انبیاء جسوقت چاہیں مثلاً انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری

جاری کر سکیں۔ بلکہ جس وقت اللہ کی حکمت بالغہ مقتضی ہوتی ہے تو جاری ہو سکتی ہیں برخلاف ان فنون کے جو تعلیم و تعلّم سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان میں جسوقت چاہیں قواعد مقررہ اور خاص خاص اعمال کی پابندی سے یکساں نتائج اور ایک ہی طرح کے آثار و کیفیات دکھلائے جا سکتے ہیں۔ مگر آج تک مدعیان نبوۃ و اعجاز کیطرف سے کوئی درسگاہ معجزہ سیکھنے سکھانیکی نہ بنی نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ ممہد ہوا، نہ کوئی کتاب تنجیم، مسمریزم سحر کیطرح معجزات سکھلانیوالی تصنیف کیگئی۔ بلکہ وہ خدا کا فعل ہے جو تمام دنیا کو تھکا دیتا ہے۔ اگر وہ فعل ہے تو اس جیسے فعل سے دنیا عاجز ہے اور اگر اقوال میں سے ہے تو اس جیسے کلام سے تمام دنیا کے بولنے والے مجبور اور درماندہ ہیں، رسول کے اختیار یا قدرت کو بھی اس میں کوئی دخل نہیں۔ اسی واسطے انبیاء سے جب معجزات طلب کئے گئے تو انہوں نے اللہ پر محول کیا۔ فرماتے ہیں:۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ
يَنْبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ
فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا ۝ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ
قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى
فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا
كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا
بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔

اور وہ تم سے کہتے ہیں کہ ہم تو اسوقت تک تم پر ایمان لانیوالے ہی نہیں کہ یا تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ بہا نکالو۔ یا کھجوروں اور انگوروں کا تمھارا کوئی باغ ہو اور اسکے بیچ میں تم بہت سی نہریں جاری کر دکھاؤ۔ یا جیسا تمھارا خیال ہے آسمان کے ٹکڑے ہم پر لا گراؤ اور خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرو۔ یا رہنے کے لئے تمھارا طلائی گھر ہو۔ یا آسمان پر چڑھ جاؤ اور جبتک تم وہاں ایک کتاب اتار کر نہ لاؤ کہ ہم آپ اسکو پڑھ بھی لیں ہم تمہارے چڑھنے کو بھی باور کرنیوالے نہیں کہدو (اے محمد صلعم) کہ میں رسول تو ہوں مگر بشر رسول ہوں، خدا نہیں ہوں (یعنی معجزہ تو بشر کا فعل نہیں ہے، خدا کا فعل ہے یا میرے قبضہ میں یہ نہیں کہ جو تم چاہو تمھیں دیدوں، بلکہ جسقدر خدا میری تصدیق کی علامات کے طور پر کافی اور مناسب جانتا ہے، ظاہر کرتا ہے،

معجزہ کچھ ایسے حالات کیساتھ آتا ہے کہ اس میں شبہ کی گنجائش نہ رہے

جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی اور معجزہ دکھلانے کے لئے عصا ڈالا اور وہ

اژدہا بن گیا۔ اس کا جواب دینے کے لئے فرعون نے بڑے بڑے ساحروں کو جمع کیا، اور وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی لاٹھیاں اور رسیاں لیکر پہنچ گئے، وہ سمجھے ہوئے تھے کہ موسیٰ بھی ہمارے ہم پیشہ ساحر ہیں۔ اسی لئے کہا اِمَّآ اَنْ تُلْقِیَ وَاِمَّآ اَنْ نَّکُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِیْنَ تم پہلے ڈالو گے یا ہم۔ مگر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم پھینکو۔ جب اُنہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں اور وہ چلتے ہوئے سانپ نظر آنے لگے تو (فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی) موسیٰؑ اپنے دل میں ڈرے۔ حالانکہ اگر وہ بھی پیشہ ور ساحر ہوتے تو ڈر کی کوئی وجہ نہ تھی۔ شیخ اکبرؒ فرملتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ خوف کیوں طاری ہوا اور کیوں طاری کیا گیا؟ یعنی خوف کا منشا کیا تھا، اور اُس کے طاری کئے جانے میں کیا حکمت تھی؟

اگر یہ کہا جائے کہ سانپوں کی صورت دیکھکر ڈر گئے تو موسیٰؑ جیسے پیغمبر کو ان لاٹھیوں سے کوئی خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ اسی نوعیت کے اعلیٰ خوارق کا تجربہ بھی دو مرتبہ کر چکے تھے۔ پہاڑ پر جو واقعہ القائے عصا کا ہوا تھا اُس پر لَا تَخَفْ سُن چکے تھے کیونکہ وہاں بھی خائف ہوئے تھے۔

وَلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ

اور اللہ نے وہیں ڈر اور خوف نکال دیا تھا

لَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ | اے موسیٰ ڈرو مت یہاں انبیاء ڈرا نہیں کرتے

پھر دوسری مرتبہ فرعون کے سامنے بھی لاٹھی ڈالکر دیکھ چکے تھے۔ شیخؒ فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ پہاڑ پر بشری خوف تھا جو کہ وہیں نکل چکا تھا۔ اب جو دوسری دفعہ طاری ہوا یہ اسوجہ سے کہ موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ میرے ہاتھ میں کوئی طاقت نہیں کوئی قدرت نہیں کہیں ساحرین کی اس شعبدہ بازی کے سامنے حق کا کلمہ پست نہ ہو جائے اور بیوقوف لوگ فتنہ میں نہ پڑ جائیں چنانچہ جواب میں ارشاد ہوا۔

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی

ڈرو مت تم ہی اونچے ہو کر رہو گے

یہ تو خوف کا منشا تھا اب اس کی علت فرماتے ہیں کہ جب ڈر گئے اور ڈرے ہوئے آدمی پر خوف اور گھبراہٹ کے جو آثار ہویدا ہوتے ہیں اُن کو محسوس کر کے ساحرین سمجھے کہ یہ ہمارے پیشہ کا آدمی ہرگز نہیں یا کم از کم اس کو کوئی ایسا ساحرانہ عمل معلوم نہیں جس سے یہ ہمارے مقابلہ میں اپنے قلب کو مطمئن رکھ سکے۔ اب جو موسیٰؑ نے اپنا عصا ڈالا جو باذن اللہ ان تمام جادو کے سانپوں کو نگل گیا تو ساحرین نے یقین کر لیا کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے۔ وہ سب بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور چلا اُٹھے کہ ہم بھی موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون نے بہت کچھ دھمکیاں دیں اور خوفزدہ کرنا چاہا مگر ان کا جواب صرف یہ تھا کہ

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَآ اَکْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی

جو کچھ تجھے فیصلہ کرنا ہو کر گذر تو اس سے زیادہ نہیں کہ صرف اسی دنیا کی (چند روزہ) زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں۔ تا وہ ہماری خطائیں اور ان ساحرانہ حرکتوں کو معاف فرمائے جو تو نے ہم سے زبردستی کرائیں اور اللہ سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

اور جو لوگ ایسی آیات بینات کو دیکھ کر بھی راہ حق پر نہ آئے اُن کا بھی حال یہ تھا۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ظلم سے اور زیادتی سے حالانکہ اُن کے دلوں کو سچائی کا پورا پورا یقین حاصل تھا

خود فرعون کو خطاب کر کے حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا

تو خوب جانتا ہے کہ یہ آیات آسمان و زمین کے پروردگار کے سوا کسی نے نہیں اُتاری اور فرعون! بیشک میں تجھے سمجھتا ہوں کہ تو (اس علم کے باوجود) ہلاکت میں گر چکا ہے

معجزہ میں دعویٰ نبوت کی شرط کیوں لگائی گئی

معجزہ میں دعویٰ کی شرط بھی لی گئی ہے۔ یعنی نبوت کا دعویٰ بھی کرے۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ سب فرقے مانتے ہیں کہ خدا سب سے زیادہ سچا ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیلاً اور جھوٹ کے نقص سے اُس کی ذات پاک ہے تو میں کہتا ہوں کہ جھوٹ کبھی تو اسطرح ہوتا ہے کہ ایک شخص خود خلافِ واقع بات کہے۔ اور کبھی اسطرح کہ جھوٹی بات جو دوسرے نے کہی ہے اس کی تصدیق کردے۔ پھر تصدیق بھی دو طرح سے ہوتی ہے۔ کبھی زبان سے کبھی عمل سے۔ اور یہ عملی تصدیق بسا اوقات قولی تصدیق سے بڑھکر موثر ہوتی ہے جیسے ایک شخص بادشاہ کی مجلس میں یہ کہتا ہے کہ بادشاہ کو میرے ساتھ خاص الفت یا رعایت ہے، میں اُس کا معتمد خاص ہوں، جو میں کہونگا بادشاہ ضرور تسلیم کریگا اور یہ اُسکی دعاوی بادشاہ مجلس میں خود سُن رہا ہو۔ اس کے بعد وہ شخص اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے بادشاہ سے کہتا ہے کہ فلاں شخص کو خط لکھدیجئے، فلاں حاکم کو معزول کردیجئے، فلاں امیدوار کو عہدہ دیدیجئے۔ پھر کہتا ہے کہ آپ ذرا کھڑے ہو جائیے۔ پھر کہتا ہے کہ آپ بیٹھ جائیے۔ اور بادشاہ بھی ازراہ مہربانی اپنے عام ضابطہ اور عادت کے خلاف اس کے کہنے کے موافق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بادشاہ نے اس کے قول کی عملی تصدیق کردی جو کہ قولی تصدیق سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ اگر بادشاہ قول سے تصدیق کرتا تو شاید اتنا موثر نہ ہوتا۔

اتنی بات اس مثال میں ضرور ہے کہ بادشاہ ایک انسان ہے۔ وہ جھوٹی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ جل شانہٗ کے یہاں جھوٹ اور کذب کی قطعاً گنجایش نہیں ہے۔

معجزہ نبوۃ کی فعلی تصدیق ہے

پس جو نبی دعوی کرتا ہے کہ میں نبی ہوں، اگر میری بات سنوگے، مانوگے تو نجات ہے ورنہ عذاب مخلد میں گرفتار ہو جاؤگے۔ نجات کا راستہ منحصر ہے میری متابعت میں اور یہ دعوی اللہ کے سامنے کرتا ہے، اللہ کی زمین پر اور اس کے آسمان کے نیچے باآواز بلند کہتا ہے کہ میری متابعت کے بغیر کوئی راستہ نجات کا نہیں ہے اور اس کی یہ

دلیل پیش کرتا ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیز ظاہر فرمائیگا جو اُس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا اُن کی مثال لانے سے عاجز ہوگی۔ پھر اس کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اُس کے دعویٰ کی تصدیق ہے۔ درحقیقت معجزہ نبی کے دعوے کی عملی تصدیق ہوتی ہے اور اللہ چونکہ جھوٹی تصدیق نہیں کر سکتا لہذا نبی کا دعویٰ معجزہ کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہم بلا خوف تردید یہ یقین رکھتے ہیں کہ خداوند قدوس جو کہ تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے کسی انسان کو یہ دسترس نہ دیگا کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرکے ایسے خوارق عادات دکھلائے کہ دنیا اُس کے مقابلہ سے عاجز ٹھہرے جس کا جی چاہے اب بھی اس ضابطہ کا امتحان کر دیکھے۔ ضرور ہے کہ خدا ایسے حالات بروئے کار لائیگا کہ اُس کی طرف سے جھوٹے کی عملی تصدیق نہ ہونے پائے۔

فعلی تصدیق کی مثال

آپ جلسوں میں دیکھتے ہیں اور کونسلوں اور پارلیمنٹوں کا حال سنتے ہیں کہ جب کسی مسئلہ پر کسی تجویز پر کسی انتخاب پر بحث ہو جاتی ہے تو ایک طرف سے محرک اپنی تحریک پاس کرانی کے لئے حضار کے سامنے بسط سے دلائل بیان کرتا ہے۔ اور دوسری طرف تردید کرنیوالا اُس کے تردیدی دلائل مفصلاً سامنے رکھتا ہے۔ اس ردّ و کد کے بعد فیصلہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ رائے لی جائے جس کی صورت یہ ہے کہ ہاتھ اُٹھوائے جاتے ہیں اور یہی ہاتھ اُٹھا دینا یا نہ اُٹھانا اس ریزولیوشن کی تصدیق و تائید یا تکذیب و تردید کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے زبان ہلانیکی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک شخص کی نسبت پبلک جلسہ میں رائے لیجاتی ہے کہ آیا اس پر جمہور کو اعتماد ہے؟ اس پر ہاتھ اٹھا دیئے جاتے ہیں یہی علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ ان سب کی رائے اس شخص کے حق میں ہے۔ ہم دن رات میں سینکڑوں دفعہ اپنے ہاتھ اوپر کو اُٹھائیں اس کو کسی چیز کے ثابت کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن یہی ہمارا ہاتھوں کی وضع طبعی اور ہیئت اصلی کے

خلاف اوپر کو اٹھا دینا جب کسی ریزولیوشن کی تسلیم و انکار یا کسی دعوی کی صحت و بطلان کی آزمایش کے موقعہ پر ہو تو کسی غبی سے غبی انسان کو بھی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں رہتی اسوقت ان کھڑے ہوئے ہاتھوں ہی کے شمار سے رایوں کا شمار کر لیا جاتا ہے اور پھر بڑے نازک اور عظیم الشان مسائل کے فیصلے ہاتھ کی اس غیر طبعی حرکت پر بیچون چرا ہو جاتے ہیں پس جس طرح ہاتھوں کا نیچے لٹکائے رکھنا آدمی کی عام عادت اور وضع طبعی کے موافق ہے۔ اور اوپر کو اٹھانا کبھی کبھی خاص ضرورت اور مصلحت سے ہوتا ہے اور یہی غیر طبعی وضع جب کسی ریزولیوشن پر ووٹ لینے کے وقت اختیار کی جائے تو اس ریزولیوشن یا دعوے کی بیشک و شبہہ تصدیق و تائید سمجھی جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کا جو فعل سنن طبیعیہ کے سلسلہ میں ظہور پذیر ہو وہ اس کی عام سنۃ اور عادت کہلاتی ہے۔ اور جو اسباب سے علیحدہ ہو کر کسی خاص مصلحت اور حکمت کے اقتضاء سے ظاہر ہو وہ خرق عادت ہے اور یہی خرق عادت جب کسی شخص کے دعوی نبوۃ اور تحدی کے بعد اس سے یا اس کے کہنے کے موافق صادر ہو یہ معجزہ ہے جو کہ من اللہ اس کے دعوی کی فعلی تصدیق ہے۔ اور میں کہہ چکا ہوں کہ حق تعالیٰ کسی جھوٹے کی قولاً یا فعلاً تصدیق نہیں کر سکتا لہذا ہم کو ایسے مدعی کے دعوے میں شک کرنیکا کوئی حق نہیں

وحی کی تعریف و ضرورت

اللہ تعالیٰ کا خطاب کسی ایسے شخص سے جس کے دعوے نبوت کی تکذیب کے لئے کوئی صحیح علامت نہ پائی جاتی ہو اس کا نام وحی ہے۔ وحی اصولی طور پر قریب قریب یکساں ہے یعنی نفس فعل میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ کلی شکک کے طور پر وحی کے مراتب اور درجات ہیں۔ جب سے دنیا پیدا کی گئی اسی وقت سے بندوں کو ہدایت کی ضرورت ہے یعنی انسان میں یہ معلوم کرنے کی ایک طبعی اور فطری خواہش ہے کہ کن خیالات اور اعمال سے اس کو اللہ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے جیسے کہ انسان

کو بھوک لگتی ہے، غذا کی خواہش میں مضطرب اور بیتاب ہو کر انتڑیاں سکڑنے لگتی ہیں۔ پیاس لگتی ہے، پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، زبان سوکھ جاتی ہے۔ جس طرح حق تعالیٰ نے فطری طور پر بندہ کو بھوک یا پیاس لگائی اسی طرح ایک اور بھوک اور پیاس روحانی بھی لگادی ہے جو وصول الی اللہ اور معرفت کی ہے اور یہ پیاس اور بھوک بھی فطری ہے۔ مذاہب اور امکنہ و ازمنہ کا اختلاف اس فطرۃ پر کوئی اثر نہیں ڈال سکا مسلمان آریہ، ہندو، عیسائی، یہود، مجوس ایک چیز کی تلاش میں ہیں۔ البتہ بعضوں کا راستہ غلط ہے۔ مگر مقصد ایک ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کی خواہش، سچائی کی تلاش وصول الی اللہ، معرفت ربانی اور اللہ سے نزدیک ہونے کی تمنا ایک چیز ہے جو کہ انسان کے لئے فطری اور طبعی امور میں سے ہے۔

وحی کی ضرورۃ سے انکار کرنیوالونکی مثال

ہاں جب کبھی جیسا کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے تو بھوک پیاس جیسے فطری اور طبعی امور بھی اس سے کنارہ کر لیتے ہیں۔ ٹھیک اسیطرح وہ ملاحدہ جو کہ دنیا کی زندگی اور لذات میں محو ہو چکے ہیں شاید اُن کو معرفت الٰہی کی بھوک اور روحانی پیاس نہیں رہی ہے اور اسی لئے ایسے روحانی بیماروں کا وجود کسی خاص زمانہ یا مکان میں ایسی وبا کی کثرت ہماری فطری ہونے کے دعوی کو مخدوش نہیں کر سکتی۔

وحی کی طرف انسان کی احتیاج فطری ہے

پس جس طرح حق تعالیٰ نے ہمارے جسمانی امور فطریہ کا انتظام کیا ہے۔ ہماری بھوک کے لئے غلہ زمین سے اُگاتا ہے، پانی آسمان سے اُتارتا ہے، ناممکن ہے کہ ہماری روحانی بھوک کے لئے کوئی انتظام نہ کرے۔ بلکہ اُس کی رحمت کاملہ سے یقین ہے کہ جسطرح مادی حوائج و ضروریات کے لئے مادی سامان مہیا فرماتا ہے اُس سے زائد روحانی ضروریات کے لئے روحانی سامان ضرور مہیا کریگا۔ ظاہری پیاس کے بجھانے کیلئے

جس طرح اُس نے پانی کے چشمے پیدا کئے ہیں اسیطرح روحانی پیاس کے لئے روحانی چشمے ہونے چاہئیں اور وہ چشمے وحی الٰہی کے صاف اور شیریں چشمے ہیں۔ اور اس بات کو آریہ سماج بھی مانتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ سامان کرنا تھا وہ ابتدائے آفرینش ہی میں کیا جا چکا ہے۔ پھر بار بار اس میں تغییر و تبدیل یا تجدید اور تدریج کی ضرورت نہیں۔

نزولِ وحی میں تدریج

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت تکوینیات میں یہ ہے کہ وہ اگرچہ تمام اشیاء کو دفعۃً پیدا کرنے پر قادر ہے بتدریج ہی پیدا کرتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا
نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ؁

اور کوئی چیز کیوں نہ ہو اُس کے خزانے ہمارے پاس ہیں۔
اور ہم اُسکو اُتارتے ہیں ایک معین اور جچی تلی مقدار میں۔

ہر چیز کو دفعۃً پیدا کرنا خدا کے لئے کچھ مشکل نہ تھا مگر ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ درخت کا بیج ڈالو تو بتدریج ایک عرصہ کے بعد درخت بن جائیگا۔ زوجین کا قربان ہوتا ہے مہینے گذرتے ہیں، مختلف اطوار و ادوار میں بہت سے چکر ہیں تب بچہ بنتا ہے۔ گو یکدم بنانے پر قادر تھا جس طرح تمام حیوانات کو پرے کے بعد یکدم بناتا ہے اور اُس کو اس میں ذکان بھی نہ ہوتا لیکن عادت اس کے برخلاف ہے۔ اب اگر کہو گے کہ یہ عادت کیوں ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ مادہ میں استعداد ہی ایسی ہے۔ پھر اگر کہو گے کہ ایسی استعداد کیوں ہے؟ اس کا جواب گذر چکا ہے کہ ہر جگہ "کیوں" نہیں پوچھا جا سکتا۔ بلکہ آخر میں ایک موحد یہی کہیگا کہ اللہ کے علم محیط میں یہی قرین مصلحت تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی عادت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت سی اشیاء کو بتدریج بناتا ہے۔ اور جن اشیاء کی نسبت ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ شاید دفعۃً پیدا ہو گئی ہوں جیسے چاند، سورج، ستارے وغیرہ۔ ان میں بھی باعتبار فیض رسانی اور دوسری اشیاء سے تعلق رکھنے کے تدریج اور تغییر و تجدید مشاہدہ کی

پس ہمارا خیال یہ ہے کہ جس طرح وقتاً فوقتاً ضرورت پیش آنے پر اللہ تعالیٰ بارش نازل کرتا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک ہی بارش ہمیشہ کی ضروریات کے لئے کافی ہو جائے پھر ضروری نہیں کہ ہر ایک بارش یکساں زمانہ تک کفایت کر سکے۔ کبھی دو چار دس دن کیلئے روک تھام ہو جاتی ہے، کبھی اتنی بارش ہوتی ہے کہ کئی ماہ تک ضرورت نہیں رہتی۔ ٹھیک اسیطرح اقوام عالم کی ارواح وقلوب کی کھیتیوں کو ابھارنے اور سرسبز کرنیکے لئے بھی اللہ تعالیٰ وحی والہام کی بارش حسب ضروریاتِ زمانہ اور حسب استعداد قلوب مختلف زمانوں میں کرتا رہا ہے۔ کبھی تو وحی الٰہی کی بارش ایسے زور وشور کی ہوئی کہ قرنوں تک اس کی تری زمین سے نہ گئی۔ اور کبھی تھوڑا سا ترشح کافی سمجھا گیا۔ فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ۔ اسی طرح لگاتار چھوٹی بڑی بارشیں مختلف اقوام وممالک پر ہوتی رہیں۔ اور ہر ایک نے چھوٹی یا بڑی میعاد تک زمین والوں کی روحانی کھیتیوں کو سیراب کیا۔ آخر ایک وقت آیا کہ خدا کی ساری زمین خشک اور پیاسی ہو گئی، ہدایت کے چشمے سوکھ گئے، چاروں طرف آگ برسنے لگی، بد اعتقادیوں اور بد اعمالیوں کی آندھیوں اور لُو نے تمام روحانی کھیتیوں کو جھلس ڈالا۔ اُسوقت بطحا کے پہاڑوں سے ایک گھٹا اٹھی جو آخر کار ساری دنیا پر چھا گئی۔ اور وحی الٰہی کی وہ موسلا دھار اور عالمگیر بارش ہوئی جس نے ایک مدت مدید تک دوسری بارش کی کوئی ضرورت باقی نہ چھوڑی جب تک اس بارش کا کافی اثر باقی رہیگا۔ دوسری بارش نہ آئیگی۔ اسی بارش کے پانی سے جو بڑے بڑے تالابوں اور نہروں میں جمع ہو گیا ہے۔ وقتاً فوقتاً زمینوں کی آبپاشی ہوتی رہیگی۔ اور جب یہ پانی تمام ہو جائیگا تو مخبر صادق کی خبر کے موافق یہ دنیا بھی ایک آخری سنبھالا لیکر داعی اجل کو لبیک کہیگی:۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ	یا اُن منافقوں کا ایسا حال ہی) جیسے آسمانی بارش کہ اسمیں کئی
وَّبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ	طرح کے) اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی۔ موت کے ڈر سے مارے

الصواعق حذر الموت واللہ محیط بالکفرین

وفی الحدیث قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل ما بعثنی اللہ بہ من الھدی والعلم کمثل الغیث الکثیر اصاب ارضا فکانت منھا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء فانبتت الکلاء والعشب الکثیر وکانت منھا اجادب امسکت الماء فنفع اللہ بھا الناس فشربوا وسقوا وزرعوا واصاب منھا طائفۃ اخری انما ھی قیعان لا تمسک ماء ولا تنبت کلاء فذلک مثل من فقہ فی دین اللہ ونفعہ ما بعثنی اللہ بہ فعلم وعلم ومثل من لم یرفع بذلک راسا ولم یقبل ھدی اللہ الذی ارسلت بہ متفق علیہ۔

کڑک کے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ منکروں کو گھیرے ہوئے ہے کہ اس کی پکڑ سے کہیں نہیں نکل سکتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو ہدایت اور علم دیکر مجھکو خدا نے بھیجا ہے وہ ایک موسلا دھار بارش کی طرح ہے جو خدا کی زمین پر برسی پھر زمین کا ایک عمدہ (سیر حاصل) قطعہ تھا جس نے بارش کے پانی کو قبول کرکے گھانس اور سبزہ اُگایا اور دوسرا قطعہ تھا جہاں پیداوار کچھ نہیں ہوئی لیکن اُسنے پانی کو اپنے اندر روکے رکھا جس سے لوگ منتفع ہوئے اور انہوں نے خود پیا اور جانوروں کو پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا اور تیسرا زمین کے ایک ایسے حصہ پر بھی بارش کا پانی پہنچا جو چٹیل اور شور تھی کہ نہ تو وہاں پانی رُکتا ہے اور نہ گھانس اور سبزہ اُگتا ہے تو سمجھو کہ پہلی مثال ہے اُس شخص کی جسنے دین کی سمجھ حاصل کی اور جو چیز خدا نے مجھ کو دی تھی اُسنے اسکو نفع پہنچایا، اس نے خود بھی علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی سکھلایا۔ اور آخری مثال ہے اُسکی جسنے اُس ہادی کیطرف گردن اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور نہ اُس ہدایت کو قبول کیا جسے دیکر میں بھیجا گیا تھا۔

وحی کا تدریجی اور غیر تدریجی ہونا دونوں امکان میں داخل ہیں لیکن تدریجی ہونا عادت الٰہی کے موافق ہے

پہلے گذر چکا ہے کہ وحی اور الہام کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تدریج ہو یا دفعۃً۔ پس ہمارے اصول کے موافق جب عدم محض سے دنیا کو پیدا کیا گیا۔ اور آریوں کے نزدیک جب پرلے کے بعد دنیا موجود ہوئی۔ اسی وقت سے آدمیوں کو الہام اور وحی کی ضرورت ہونی چاہئے اسلئے کہ ان کو اب زندگی بسر کرنی ہے۔ اور معاش اور معاد کی درستی کے اسباب بہم

پہنچانے ہیں جو بجز ایک ملہمانہ تعلیم کے متصور نہیں۔ معرفت الٰہی کی روحانی پیاس جو ایک فطری امر ہے اور اپنے رب اور مالک حقیقی کو خوش رکھنے کی تمنا جس کا بیج بنی آدم کے قلوب میں ازل سے بکھیر دیا گیا ہے شروع ہی سے ایک ایسے صاف، شیریں اور روح پرور چشمہ کی تلاش میں ہے جو تشنگان رضاء مولیٰ کو سیراب اور ان کی روحانی کھیتیوں کو سرسبز شاداب کر سکے۔ چنانچہ حق جل و علا کی حکیمانہ رافت و رحمت ملاحظہ ہو کہ زمین کے آباد کرنیوالے نے ابھی تک زمین پر قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ پروردگار حقیقی نے اُسے تمام ضروری چیزوں سے نام بنام واقف کر دیا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ﴿ اور آدمؑ کو سب (چیزوں کے) نام بتا دیئے۔

بلاشبہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بڑے تعجب کی بات تھی۔ جس خدائے رحمٰن نے ہماری پیدائش سے پیشتر ہمارے مادی حوائج کا کافی انتظام کر دیا، زمین پیدا کی جس پر ہم کو بسنا اور کاروبار کرنا تھا اور اس کو ہر طرح کی غذاؤں اور اسباب زندگی کا ایک گودام بنا دیا۔ چشمے اور دریا جاری کر دیئے، کنوؤں میں پانی کا ذخیرہ محفوظ کر دیا۔ زندہ رہنے اور سانس لینے کیلئے تمام فضا میں ہوا پھیلا دی۔ آسمان کی مضبوط چھت میں کیسے درخشاں اور آنکھوں کی خیرہ کرنیوالی قندیلیں روشن کر دیں۔ غرض علویات اور سفلیات کا ایسا نظام قائم کیا کہ اس خاک کے پتلہ کو اپنی ضروریات میں اس سے نفع اُٹھانا آسان ہو۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسا مہربان خدا ہماری روحی اور باطنی ضروریات کیطرف توجہ نہ فرماتا۔ اس نے ابتداء آفرینش سے ہی ہدایت کے چشمے جاری کئے، وحی اور الہام کی بارشیں وقتاً فوقتاً برسائیں اور جس جس وقت جس جس طرح اُس کے علم ازلی میں مناسب تھا روحانی زندگی کے سامان مہیا فرمائے۔ پس اگر مختلف زمانوں میں مادی غذا کی تیاری کے لئے مختلف طرح کی بارشوں اور بادلوں کے ادل بدل پر ہم کوئی اعتراض نہیں کر سکتے تو ہم کو اس کا بھی کچھ حق نہیں پہنچتا کہ ہم بہت سے انبیاء و مرسلین اور اُن کی شرائع

کے ارسال وانزال پر کسیطرح کی حرف گیری کر سکیں۔ متعدد شرائع کے نزول میں جو تدریج وتغیر مرعی ہوتی ہے وہ شخص اکبر (عالم) کے حق میں اس سے زائد نہیں کہ ایک طبیب کسی بیمار کو کئی دن تک منضج پلانے کے بعد مسہل دینے لگے یا تنقیہ خاص کے بعد تنقیہ عام کا مشورہ دے کوئی عقلمند بھی اسوقت یہ نہ کہیگا کہ طبیب نے منضج پلانے میں کچھ غلطی یا بھول چوک ہوگئی تھی جس کی تلافی اس نے مسہل کے نسخہ سے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طبیب دانا مریض کی ہر ایک حالت کے مناسب دوا تجویز کرتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ وہ حکیم وعلیم خدا بھی عالم کے مزاج اور تغیر احوال وعوارض کی رعایت سے کبھی جلد جلد اور کبھی بدیر اُس کے حالات کے مناسب نسخہ بدلتا رہتا ہے اور بعض اوقات کسی نسخہ کا استعمال بہت دیر تک قائم رکھتا ہے۔ کیونکہ مریض کے حالات کا تغیر اُس نسخہ کے اجزاء پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں سوال امکان اور قدرت کا نہیں، بلکہ عادت الٰہی کا ہے اور یہ پہلے گذارش کیا جا چکا ہے کہ عادت سے اس کے خلاف قدرت رکھنے کی نفی نہیں ہوتی۔ وحی کے مراتب کی تدریج اور تفاوت کو آپ ایک اور مثال سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جس طرح انسان کی ظاہری آنکھ مبصرات کے دائرہ میں اسوقت اپنا فعل کر سکتی ہے جب کہ اُس کے اندر نور بصارت موجود ہو اور مبصر (یعنی جس چیز کو دیکھنا ہے) وہ بھی کسی قسم کی خارجی روشنی کی احاطہ میں ہو اگر اندرونی اور بیرونی روشنیوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو جائے تو آنکھ کے لئے دیکھنا ناممکن ہے ٹھیک اسیطرح غیبیات اور امور معاد کا سمجھنا بھی دو روشنیوں پر موقوف ہے۔ ایک اندرونی جو عقل کی روشنی ہے دوسری بیرونی جس کو وحی کی روشنی سے تعبیر کیا جاتا ہے گویا عقل انسانی نہ تو بیکار رہی ہے اور نہ وحی سے مستغنی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد لیل ونہار کے نظام پر غور کیجئے کہ شب میں جوں جوں تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے تو ستاروں کی چمک میں بھی تیزی آتی جاتی ہے۔ تاریک کمروں میں

لالٹین چراغ وغیرہ سے روشنی کا سامان کیا جاتا ہے جن کو قدرت کے فیض نے تاریک اوقات میں دنیا کے کاروبار جاری رہنے کے لئے میسر کر دیا ہے۔ ستاروں سے جہازوں کے چلنے چلانے میں مدد ملتی ہے۔ اور خشکی اور تری میں لوگ ان کے ذریعہ سے وقت اور سمت کی تعیین کرتے ہیں۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ۝ اور لوگ ستاروں سے بھی راہ معلوم کرتے ہیں۔

گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں سے لوگوں کا کاروبار چلتا ہے جب صبح ہوتی ہے اور سورج نکلتا ہے تو تمام مختلف روشنی کے سامان نابود ہو کر ہزاروں آلات روشنی کے بجائے تنہا ایک روشنی سورج کی کام دیتی ہے۔

قدرت یہ بھی کر سکتی تھی کہ سورج کو ہمارے سر پر ہمیشہ کھڑا رکھتی مگر ایسا نہ کیا جس کی مصالح اور حکمتوں کا احصا، خدا ہی کر سکتا ہے۔ بہر حال اس سے اسقدر ضرور معلوم ہوا کہ ظاہری نور (روشنی) متدرج اور متفاوت ہو سکتی ہے اور اس تدریج اور تفاوت کے باوجود ایک ایسا مرتبہ بھی آسکتا ہے جو تمام مدارج کو ختم کر کے صرف ایک ہی درجہ کو باقی رکھے جو کہ اپنے مستفیدین کو سب ستاروں اور چراغوں کی روشنی سے مستغنی کر دے اور سب چھوٹی بڑی روشنیاں اسی ایک روشنی میں محو اور مدغم ہو جائیں۔ پس اگر روحانی نور یعنی وحی اور الہام خداوندی میں بھی تدریج ہو اور آخر میں اس کا ایک درجہ ایسا بھی آجائے جس کے بعد کوئی درجہ باقی نہ رہے تو اس میں کیا تعجب ہے۔

حضور نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر ایک نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا لیکن میں تمام آدمیوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔

وحی میں باوجود اصولی اتفاق کے فروعی تفاوت

یہ بات فراموش نہ کیجائے کہ تمام انبیاء کے پاس اصول کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہوتی تھی

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْ	لوگو، اس نے تمہارے دین کا وہی رستہ ٹھہرایا ہے

اوحینا الیک وما وصینا بہ ابرٰھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ

جس (پر چلنے) کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور (اے پیغمبر) تمہاری طرف بھی ہمنے اسی راستہ کی وحی کی ہے اور اس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھی، حکم دیا تھا کہ (اسی) دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

البتہ مختلف انبیاء، اور اُن کی شرائع میں اصول کو بحالہا قائم رکھتے ہوئے ازمنہ اور امکنہ اور امزجہ کے اختلاف سے زوائد کا خفیف سا تغیر و تبدل ہو جاتا ہے اس کو یوں سمجھو کہ انسانوں کی عام غذا ہمیشہ ایک قسم کی ہے۔ مثلاً روٹی یا چاول اور پانی لیکن زوائد اور فروع میں باعتبار اوقات و موسم تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جاڑے میں سوہن حلوہ، گاجر اور انڈوں کا حلوہ، اور گرمی میں فیرنی، فالودہ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اسی اصول کے اتفاق اور زوائد کے اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ابوھم واحد وامھاتھم شتی (یعنی انبیاء کرام کی مثال ان بھائیوں کی طرح ہے جن کا باپ ایک، والدہ مختلف ہوں۔

خاص خطاب کے بعد وحی کا عالمگیر خطاب

یعنی

نبوت خاصہ کے بعد نبوت عامہ

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ مختلف اقوام کی طرف مختلف نبی اور نذیر ہدایت کیلئے آئے۔

وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر (اور کوئی امت ایسی نہیں (ہوئی) کہ اس میں کوئی ڈرانیوالا نہ گذرا ہو) جو مختلف زمانوں میں اپنے منصب کے موافق رہنمائی کا فرض ادا کر کے چلے گئے۔ ان سب کے بعد ایک ہادیٔ اعظم اور منذر عام آیا جو کہ تمام مخلوق کے لئے ہادی ہے۔

لیکون للعٰلمین نذیراً (تاکہ تمام جہان کے (لوگوں کے) لئے (عذاب خدا) سے ڈرانیوالا ہو۔

پس ضروری تھا کہ ایسے منذر عام کے پاس ایسی کتاب ہو جو کہ تمام لوگوں کی ہدایت اور عام اقوام کی رہبری کے لئے ابدی طور پر ضامن اور متکفل ہو جائے۔ اس سے پہلے مفصلاً گذر چکا ہے کہ خدائی کلام کو ہم خدائی کام کی طرح پہچان سکتے ہیں۔

قرآن اور اُس کی جامعیت

آؤ! اس منذرِ عام کی اُس کتاب کو دیکھیں جو قرآن کے نام سے معروف ہے کہ آیا وہ خدا کا کلام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ جب تم اس کی تفتیش کروگے تو تم کو اس کتاب میں تہذیب اخلاق، طریق تمدّن و معاشرت، اصول حکومت و سیاست، ترقی روحانیت، تحصیل معرفت ربانی، تزکیہ نفوس، تنویر قلوب۔ غرضیکہ وصول الی اللہ اور تنظیم و رفاہیت خلائق کے وہ تمام قواعد و سامان موجود نظر آئیں گے جن سے کہ آفرینش عالم کی غرض پوری ہوتی ہے اور جن کی ترتیب و تدوین کی ایک امی قوم کے امی فرد سے کبھی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ان تمام علوم و حکم کا تکفّل کرنے کے ساتھ جن کے بغیر مخلوق اور خالق کا تعلق صحیح طور پر قائم نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مخلوق دوسری مخلوق کے حقوق کو پہچان سکتی ہے۔ اس کتاب کی غلغلہ انداز فصاحت و بلاغت، جامع و موثر اور دلربا طرز بیان، دریا کا سا تموّج اور روانی، سہل ممتنع سلاست، اسالیب کلام کا تفنن اور اس کی لذت و حلاوت اور شہنشاہانہ شان و شکوہ۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑی بلند آہنگی سے سارے جہان کو مقابلہ کا چیلنج دیدیا ہے۔ جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آرا نے غیب کی نقاب اُلٹی، اور آدم کی اولاد کو اپنے سے روشناس کیا اُس کا برابر یہی دعوٰی رہا کہ میں خدائے قدوس کا کلام ہوں اور جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین اور خدا کی سورج جیسا سورج اور خدا کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہیگی۔ قرآن کے مٹانے کی لوگ سازشیں کریں گے، مکر گانٹھیں گے۔ مقابلہ کے جوش میں کٹ مریں گے، اپنی مدد کے لئے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے، کوئی حیلہ کوئی تدبیر، کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے، اپنے آپ کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے۔ سارے نقصانات

اور مصائب و دواہی کا تحمل ان کے لئے ممکن ہوگا مگر قرآن کی ایک چھوٹی سی سورۃ کا مثل بنالانا ممکن نہ ہوگا۔

نبی امی اور اُس کا اعجاز قرآنی

پھر طرفہ یہ ہے کہ جو ہادی اس کتاب کو لایا اُس نے نہ کسی درسگاہ میں تعلیم پائی نہ کسی لائبریری کا مطالعہ کیا، نہ کسی اُستاذ اور معلم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور نہ اُس کے گرد و پیش ایسے بیش بہا تعلیمات کا کوئی مواد موجود تھا بلکہ اُس کی اور اُس کی قوم کی وہ حالت تھی جس کو قرآن نے یوں ادا کیا۔

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ
الْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

وہ (خدا) ہی تو ہے جس نے (عرب کے) جاہلوں میں اُن ہی میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا (کہ وہ) اُن کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور اُنکو (کفر و شرک کی گندگی سے) پاک صاف کرتے اور اُنکو کتاب (الٰہی) اور عقل کی باتیں سکھاتے ہیں ورنہ (اس سے) پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی (میں مبتلا) تھے

نہ صرف یہ کہ قرآن نے اس کے امی ہونیکا اشارہ کیا بلکہ امی کا وصف اُس کیلئے بمنزلہ ایک ممتاز لقب کے استعمال فرمایا جس جگہ یہ فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ
يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ

(ان سے ہماری مراد اس زمانہ کے وہ اہل کتاب ہیں) جو ہمارے (ان) رسول نبی امی (محمدؐ) کی پیروی کرتے ہیں جن کی بشارت کو اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اور ایک موقع پر آپ کی نوشت و خواند کے متعلق اُن لوگوں کے مجمع میں جن سے آپ کی چہل سالہ طویل زندگی کا کوئی ممتد واقعہ خصوصاً وہ کہ جس میں احتیاج غیروں کی ہو مستور نہ رہ سکتا تھا، صاف صاف اعلان کر دیا گیا۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ
بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝

نہ تو تم قرآن سے پہلے کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھ سکتے تھے اگر ایسا ہوتا تو بیشک باطل پرستوں کو کچھ شک و شبہ کی گنجائش ہوتی۔

یہی نہیں کہ آپ رسمی نوشت و خواند سے بالکل الگ تھلگ رہے، بلکہ جو چیز بڑے سے بڑے متعصب معاند کو بھی محو حیرت بنا دینے والی ہے وہ یہ ہے کہ آپ باوجود عرب کے

نہایت ہی واجب التعظیم معزز و ممتاز خاندان میں سے ہونے کے اس فن شاعری سے بھی ناآشنا رہے جس میں اُس سرزمین کے بچے اور چھوکریاں بھی طبعی سلیقہ کی موافق ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایسے ملک کا جہاں کی زمین نباتات کیطرح شاعروں کو اگاتی تھی، ایسا مایہ ناز فرزند شعر گوئی سے کوئی علاقہ نہ رکھے؟ ایک شعر بھی اس کا عرب کے دواوین میں موجود نہ ہو۔ کسی مشاعرہ میں ایک قصیدہ بھی اُس نے نہ پڑھا ہو جو یہی گمان کر لیا جائے کہ شاعری سے ترقی کرتے کرتے شاید وحی و الہام کا دعویٰ کر دیا ہوگا۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ | اور ہم نے ان (پیغمبر محمد) کو شاعری نہیں سکھائی اور شاعری ان کی شان کے لائق بھی نہیں

پھر لائے تو پورے چالیس سال کے بعد ایک ایسا کلام لائے جو نہ قصیدہ ہے نہ غزل ہے۔ نہ مرثیہ ہے، نہ اُس رنگ ڈھنگ کا کوئی کلام اُنکے یہاں موجود ہے، نہ اس طرح کی کوئی تصنیف وہاں پائی جاتی ہے۔ بلکہ وہ آفتاب کی طرح مکانوں کو نہیں، دلوں کو روشن کرنیوالا کلام ہے۔ وہ حکمت ہے۔ علم ہے۔ شفا ہے۔ برہان ہے۔ نور ہے۔ قانون ہدایت ہے۔ خلاصہ یہ کہ خدا کے علم سے روشن کی ہوئی مشعل ہے جسے نہ کوئی ہوا کا جھونکا گل کر سکتا ہے نہ کوئی آندھی بجھا سکتی۔ دنیا کے فصحا و بلغا نے اُس امی کی لائی ہوئی کتاب کے سامنے سپر ڈالدی۔ بڑے بڑے شاعر ایسے بہک گئے کہ جس آدمی نے مدۃ العمر ایک شعر نہیں کہا تھا محض یہ کلام سُن کر اُسے شاعر بتلانے لگے۔ اس کا خارق عادت اثر دیکھ کر سحر سے تعبیر کیا کہ یہی چیز اُن کے زعم میں تمام فوق العادۃ کارناموں کی حد تھی اور بعض اُن میں سے قرآن کی فصاحت کو سجدہ کرنے لگے۔ قرآن کے علوم و قوانین نے ساری دنیا کے قانون ردی کر دیئے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ حکمتوں اور تمدنوں کو پس پا کر کے اُن کی جگہ لی اور آخر کار اُمیوں کی جماعت کو دنیا کے مدعیان حکمت و تہذیب کا معلم بنا دیا۔

* * *

آپ کا امی ہونا تاریخ کی اجلی بدیہیات میں ہے

کیا آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد کوئی شخص یہ جرات بلکہ حماقت کریگا کہ آں حضرت صلعم کے امی ہونے کو یہ کہکر جھٹلانے لگے کہ شاید آپ نے بھی دنیا کے دوسرے مصنفین کیطرح مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھی ہونگی کسی میانجی کے پاس بیٹھے ہونگے۔ کوئی کتب خانہ آپکے مکان میں چھپا ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ وہ آیات جن میں آپ کا امی ہونا بیان کیا گیا ہے ایسی قوم کو سالہا سال تک شب و روز سنائی جاتی رہیں جن کی گود میں آپ بچپن سے پلے تھے اور آپ کی عمر کا کوئی معتد بہ عرصہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا لیکن ایسی شدید عداوت اور غیظ و غضب اور آپکی تکذیب و تردید پر اسقدر حریص ہونے کے باوجود کسی ایک آدمی نے بھی یہ شہادت نہ دی کہ آپ نے فلاں مدرسہ میں تعلیم پائی ہے، یا فلاں اُستاد کی خدمت اور ملازمت میں آپ اتنی مدت تک رہے ہیں۔ اگر کوئی آواز بھی ایسی اُٹھی ہوتی تو ضرور آج تاریخ میں اس کا کچھ نشان ۔ تاریخ کے صفحات جس طرح اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے کھلے ہوئے تھے اس سے زائد آپ کے دشمنوں اور بدنام کرنیوالوں کے لئے کشادہ تھے۔ بلکہ آغاز اسلام میں ب کہ چند مظلوم اشخاص کے سوا کوئی بھی حضرت (محمد) صلعم کا کلمہ پڑھنے والا نہ تھا اور کفر و باطل کی ساری شیطانی طاقتیں آپ کے نام و نشان کو صفحہ ہستی سے معاذ اللہ مٹا دینے میں مشغول تھیں اُن کے لئے ایسا پروپیگنڈا پھیلانے کا بڑا وسیع میدان موجود تھا اور وہ بخوبی اُس کی اشاعت اطراف و اکناف میں کر سکتے تھے کہ محمد (صلعم) معاذ اللہ پنے امی ثابت کرنے کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ انہوں نے فلاں کالج میں یا فلاں روفیسر سے اتنے زمانہ تک رسمی تعلیم پائی ہے۔

پس جب کہ چودہ سو برس کی تاریخ کوئی ایسا بیان پیش کرنے سے خاموش ہے

تو تاریخ کی عزت پر یہ ایک بڑا ہی ناپاک اور کمینہ حملہ ہوگا کہ تعصب کے جوش میں محض اپنے توہمات کی بناء پر تاریخ کو جھوٹا ثابت کیا جائے اگر اسکندر رومی کی فاتحانہ ملک گیری، انوشیرواں کی عدل گستری، رستم کی شہرۂ آفاق طاقت و شجاعت، حاتم طائی کی فیاضی اور سخاوت کی تردید کر دی جائے تو غالباً تاریخ و روایت کا فن اسقدر بے اعتبار نہ ہوگا جتنا کہ نبی عربی صلعم کے امی ہونے کی نفی سے ناقابل اعتبار ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسا واقعہ ہے کہ جس کا تواتر قرآن کے تواتر کی برابر ہے۔ اس کا انکار صرف اس صورت میں ممکن ہوگا کہ ایک آدمی یہ ہی دعوی کر بیٹھے کہ محمد صلعم نامی کوئی انسان عرب میں پیدا ہی نہیں ہوئے۔ نہ انہوں نے یہ قرآن پڑھ کر لوگوں کو سنایا۔ نہ دعوی پیغمبری کیا۔ تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ محض قرآن یا حامل قرآن کی عداوت کے جوش میں گذشتہ تمام مشہور و متواتر واقعات کو بھی جھٹلانے لگیں جس کا خمیازہ نہ صرف مذہب اسلام کو بلکہ دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں خصوصاً اُس مذہب کو اُٹھانا پڑیگا جس کا وجود تاریخی زمانہ سے بھی بہت پہلے کا بتلایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص قرآن کی ضد میں اس درجہ جہالت پر اتر آئیگا کہ وہ نزول قرآن سے پہلے نبی امی کا تعلیم یافتہ ہونا ثابت کرے۔ حالانکہ وہ مشہور ضدی اور متمرد افراد بھی جنہوں نے کوئی امکانی صورت تکذیب قرآن کی اُٹھا نہ رکھی تھی تنگ اور کھسیانے ہو کر اس سے زائد نہ کہہ سکے کہ انما یعلمہ بشر ”کوئی آدمی ان کو قرآن سکھلا جاتا ہے“ ایسا کوئی حوالہ وہ بھی نہ دے سکے جس سے چالیس سال کی عمر تک ایک دن کے لئے بھی آپ کا کسی سے تعلیم پانا ثابت ہوتا بلکہ خود اُن کا یہی قول اس کی دلیل ہے کہ رسول خدا صلعم کے امی ہونے کو وہ ایسی ناقابل انکار بداہت سمجھتے تھے کہ قرآن کے علوم و معارف کو آپ کے گزشتہ مشہور معروف اُمیتہ سے تطبیق دینا اُن کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ آپ کی جگہ کسی غیر معلوم بشر کو جو تعلیم یافتہ ہو اس قرآن کا اصل مصنف قرار دیتے تھے اُسوقت شاید اُن کو یہ خیال نہ رہا کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھلانیوالا بھی

کوئی بشر ہی ہے تو کسی بشر کا مقابلہ کرنے اور اس کے کلام کا مثل لانے سے سارے جہان کی بشری اور غیر بشری طاقت عاجز نہیں رہ سکتی۔ بیشک قرآن حضرت محمد صلعم کا کلام نہیں ہے اور نہ آپ کے پاس ایسی کتاب تیار کر لینے کا کوئی طبعی سامان موجود تھا اور یہ بھی درست ہے کہ یہ قرآن ضرور آپ کو کسی اور نے پڑھایا ہے لیکن وہ پڑھانیوالا بشر نہیں تھا بلکہ وہ رب کریم تھا جو لاالعقل نطفہ اور منجمد خون کو صاحب عقل و شعور انسان بنا دیتا ہے۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔

پڑھو (اے محمد صلعم) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے

وہ جس طرح اپنی ذات و صفات میں اور اپنے کام میں بے مثل اور یکتا ہے اسی طرح اپنے کلام میں بھی بےنظیر و بے ہمتا ہے۔ مخلوق جس طرح اُس کے کام کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے اُسی طرح اس کے کلام کا معارضہ کرنے سے مجبور ہے۔ قرآن کے لانیوالے نے بڑے زور سے تحدی کی، ہر طرح لوگوں کو اس کلام کا مثل لانے کے لئے ابھارا، غیرتیں دلائیں، مقابلہ کے لئے بیدار کیا، جھنجوڑ جھنجوڑ کر اُٹھایا اور ایک ذرا سی بات پر جو اُن کے زعم میں بہت ہی آسان اور سہل الحصول ہونا چاہیئے تھی، اپنے کل دعاوی کے جھوٹ اور سچ ہونے کا فیصلہ چھوڑ دیا۔ لیکن مقابلہ کرنیوالوں نے لڑیاں لڑیں، حاملین قرآن کے مٹانے اور تباہ کرنے کی سازشیں کیں، اُن کے ذلیل اور رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا، تاہم یہ حوصلہ کسی کو نہ ہو سکا کہ قرآن کی کسی چھوٹی سی سورۃ کے جواب میں چند جملے بنا کر قرآن کے اس عظیم الشان دعوی کو غلط یا پست کر دیتا۔ (العیاذ باللہ)

قرآن نے کس طرح لوگونکو عاجز کیا؟

جیسے ہم خدائی کاموں کو مصنوعات عالم میں غور کر کے بآسانی پہچان لیتے ہیں، اسی طرح خدا کے کلام کے مقابلہ میں بہت سے شعراء کے کلاموں اور دنیا کے بڑے بڑے بولنے والوں کے نتائج افکار کو، اُن کے شستہ اور مہذب بیانوں کو، غلغلہ انداز

خطبوں کو، معرکۃ الآرا لکچروں کو عرق ریزی سے لکھی ہوئی تالیفات کو، ادبی اور علمی صنفات کو سامنے رکھ کر ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ خدائی کلام ہے، آدمیوں کا کلام نہیں۔ پس جس کلام کے متعلق یہ دعویٰ ہمارے سامنے آتا ہے کہ خدائی کلام ہے اُس میں ہم کو امور ذیل پر غور کرنا پڑیگا۔

خدائی کلام کے پرکھنے کی کسوٹی کیا ہی؟

(۱) مدعی نبوت جس کی زبان سے یہ ہم تک پہنچا اُس کی کیسی حالت ہی؟

(۲) اُس کی تعلیم کیسی ہے؟

(۳) کیا اُس جیسا آدمی ایسا کلام بول سکتا ہے؟

(۴) کیا اُس کے پاس ایسا سامان موجود ہی جس سے وہ ایسے بیش بہا علوم ومضامین ادا کرسکے؟

(۵) کیا حجاز میں کوئی علمی سامان موجود تھا؟

کیا قرآن اس کسوٹی پر پورا اُترتا ہی؟

پہلے سوال کے متعلق قرآن کے لانیوالے کی حالت جب ہم دیکھتے ہیں تو وہ ایک دیانتدار شریف النسب مگر ایک یتیم بچہ ہے۔ جس کے سر پر نہ باپ نے سایہ کیا، نہ زیادہ دنوں تک آغوش مادری کی راحت اُٹھائی، نہ اُس کے پاس کوئی ثروت ہے، نہ دولت، نہ اُسکا گھرانہ کوئی علمی یا صنعتی گھرانہ ہے، نہ اُس کے پاس لڑکپن کے زمانہ یا جوانی بلکہ نبوت کے بعد بھی کوئی ظاہری علمی سامان ہے، نہ اُس کے وطن میں کوئی مدرسہ ہے، نہ کوئی مکتب، نہ اس کے وطن میں علوم وفنون کا کسی قسم کا چرچا ہے، بلکہ وہاں کسی کے کان علوم وفنون کے چرچے سے آشنا بھی نہیں۔ ہاں اُن کے پاس اگر ہے تو صرف زبان ہی اور اسقدر طلاقت لسانی اور قادر الکلامی ہے کہ وہ تمام جہان کو اپنے سامنے گونگا سمجھتے ہیں چنانچہ عرب کے ماسوا کا جو نام عجم رکھا تھا اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ عجم کو قادر الکلام نہیں سمجھتے تھے اور اپنے مقابلہ میں سب کو ہیچ جانتے تھے۔ بڑی بڑی

بادشاہوں کے درباروں میں نہایت شان و شوکت کیساتھ بیدھڑک بولتے تھے۔ معمولی اونٹ اور بکریاں چرانیوالے ایسا برجستہ کلام کہتے تھے کہ دوسروں کو بہت فکر و تامل کے بعد بھی ویسا کہنا مشکل تھا۔ چند جملوں میں جذبات کو برانگیختہ کردیتے۔ جب بولتے تو رعد کیطرح گرجتے۔ بجلی کیطرح کڑکتے، بارش کیطرح برستے تھے۔ اور تھوڑی سی دیر میں گہے باآب گہے باآتش کا سماں کھینچدیتے تھے۔ غرض کہ لے دیکر اُن کے پاس اگر کوئی چیز تھی تو صرف زبان تھی۔ ویسے کوئی طریقہ باقاعدہ تصنیف کا نہ تھا، درسگاہیں نہ تھی، کتب خانہ اور لائبریریاں نہ تھیں۔

اب سوچو کہ اگر ایسے ملک میں کوئی ذہین اور صاحب ثروت بھی ہو تو کیا، مختلف علوم و فنون کا سیکھنا اُس کے لئے عادۃً محال نہ ہوگا۔ پھر جب اُس کے ساتھ دوسرے قدرتی اسباب بھی ایسے جمع ہوں جن کے ہوتے ہوئے سیدھی سادی زندگی بسر کرنا اور معمولی کفاف بھی مہیا کرنا مشکل ہوجائے جیسا کہ ولادت سے پہلے والد کا انتقال اور بحالت رضاعت والدہ کی وفات، پھر چچا کی پرورش میں چلے جانا، اور اسیطرح چالیس برس کی عمر کو بے سرو سامانی میں بسر کرنا، کبھی قلم کو ہاتھ بھی نہ لگانا، نہ کسی اُستاد کے سامنے کتاب کھولنا، ان سب علامتوں کو دیکھ کر عادۃ اللہ جس کو آج کل کے لوگ قانون قدرت بھی کہتے ہیں، یہ بھی بتلاتی ہے کہ ایسا شخص ابواب تہذیب و تمدن اور معارف الٰہیہ و حقائق توحید ذاتی و صفاتی و افعالی اور علوم ہدایت امم و اقوام میں کوئی سیدھی بات بھی نہ کرسکے، چہ جائیکہ وہ ایسی کتاب لاجواب اور ایسی آیات بینات لوگوں کے سامنے پیش کرے جس کو دیکھ کر ارباب فنون اور علماء متبحرین حیران رہجائیں، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے عقلاء اور حکماء اس کی چوکھٹ پر سر دھننے لگیں، اور جن و انس اس کا مثل پیش کرنے سے صریحاً عاجز و درماندہ ہوجائیں۔ جب ایسے حالات میں ایسا کلام ہم دیکھیں گے تو ضرور اس کو خدائی کلام کہنے پر از روئے عقل و انصاف و تجربہ مجبور ہونگے۔ دوسرا سوال بھی مذکورہ بالا بیان سے حل ہوگیا کہ جب ملکی اور قدرتی حالات ایسے ہوں جن کے

ہوتے ہوئے ایک فارغ البال اور خوش حال آدمی بھی اکتساب علوم اور تحصیل فنون سے عاجز ہو تو ایک بے سر و سامان کیلئے ایسی اعلیٰ التعلیم کہاں سے میسر ہو سکتی تھی۔ آپ کی سوانح سب کو معلوم ہے کہ طفولیت ہی میں یتیم ہوئے اور ہوش سنبھالنے کے بعد بعض ابواب معیشت اور دیگر افکار میں مبتلا ہو گئے۔ ہاں پیدائشی طور پر جو بہت ہی شدید اور قوی داعیہ طلب حق اور معرفت الٰہیہ کا آپ کے قلب مبارک میں موجزن تھا اور جو سخت نفرت اور بغض آپ کو فطری طور پر رسوم شرکیہ اور فحشاء و منکرات سے تھا وہ آپ کو تبتل (انقطاع خلائق) اور یکسوئی اور عزلت گزینی کیطرف مائل کرتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی آپ کئی کئی دن تک تمام انسانوں کے جوار سے علیحدہ ہو کر غاروں اور پہاڑوں میں خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کو یاد کرتے اور اپنے کانشنس کے موافق اُس کی عبادت کیا کرتے تھے، جہاں انسان کا گزر تو کیا، کوئی پرندہ بھی پر نہ مارتا تھا۔

تاریخ کی نہایت ہی معتبر اور محفوظ روایتیں جن سے بڑھ کر کوئی وثوق کی چیز تاریخ کے خزانہ میں نہیں مل سکتی، بتلاتی ہیں کہ آپ حرا کی چوٹی پر (جسے آج کل جبل النور کہتے ہیں) کئی کئی دن تنہا رہ کر اس وحدہٗ لاشریک کی معرفت کیطرف قدم اُٹھاتے تھے، کوئی شخص ان چند ایام خلوت میں بھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ آپ کے پاس خفیہ طور پر کوئی معلم جاتا تھا اور وہ آپ کو کتاب پڑھاتا تھا۔ ایسے حالات میں نزول قرآن سے پہلے آپ کے تعلیم یافتہ ہونے کا ادعا کسقدر بے دلیل بات ہے۔ قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا:۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝	قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتا تھا نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو البتہ اہل باطل شبہہ میں پڑتے

نبوت سے پہلے ایک دفعہ بچپن میں اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ اور ایک مرتبہ جوانی میں دوسرے رفقاء کیساتھ آپ کو شام کیطرف بغرض تجارت چند روز کے لئے سفر کا اتفاق ہوا۔ بحیرا راہب نے اسی سفر میں آپ کو دیکھا اور آثار رشد و صلاح اور علامات نبوت

دیکھکر حضور کے تابناک مستقبل کے متعلق کچھ پیشین گوئی بھی کی ۔ لیکن جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے، پڑھنا پڑھانا تو درکنار، کوئی شخص تاریخ سے ایک شہادت بھی اس بات کی پیش نہیں کرسکتا کہ اس چند ساعت کی صحبت میں آپنے ایک کلمہ اور ایک حرف بحیرا یا کسی اور راہب یا قسیس سے سیکھا ہو ۔ ادر اگر بالفرض ایسا ہوتا تو سب سے پہلے قافل الوں کو اور بحیرا کے متبعین کو اس کی خبر ہوتی اور وہ بڑے زور شور سے اپنی تاریخوں میں درج کرتے کہ محمدؐ معاذاللہ فلاں راہب کے شاگرد ہیں ۔ حالانکہ صفحات میں اس کا کوئی نشان موجود نہیں ۔

تیسرے سوال کے متعلق یہ کہنا ہے کہ اگر مدعی الہام ایسا ہو کہ اس نے باقاعدہ علوم وفنون کو حاصل کیا ہو اور اپنی سادہ زندگی میں اس کی فصاحت اور علمی قابلیت بھی مشہور ہوچکی ہو اور اس کے پاس ایسا سامان بھی موجود ہو جس کی وجہ سے وہ تصنیف و تالیف پر قادر ہوجائے بعدہٗ وہ ایک نفیس کتاب لکھ کر اس کے الہامی ہونے کا دعویٰ کردے تو شبہہ کی گنجائش ہوسکتی ہے ۔

کیا فیضی کی تفسیر اور سعدی کی گلستاں کو معجزہ کہہ سکتے ہیں

آپ نے سنا ہوگا کہ قرآن کے مقابلہ میں بعض خوش فہم فیضی کی بے نقط تفسیر اور سعدی کی گلستاں کو پیش کرکے یہ کہا کرتے ہیں کہ جس طرح ان دونوں کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا، اسیطرح اگر قرآن کا جواب بھی کسی نے نہ دیا تو وہ معجزہ کیونکر ہوسکیگا ۔ اور اگر وہ معجزہ ہے تو فیضی کی بے نقط تفسیر اور سعدیؒ کی گلستاں بھی معجزہ ہوگی ۔

اس کا جواب

حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ سعدی اور فیضی دونوں کے پاس سامان تعلیم و تالیف کسقدر وجود تھا ۔ کتنے عرصہ تک انہوں نے تعلیم حاصل کی ، برسوں مدرسوں میں پڑھ رہے

راتوں جاگے، مدتوں محنتیں کیں۔ سالہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں کے بعد اگر بالفرض فیضی یا حریری یا متنبی یا کوئی اور عربی میں، سعدی فارسی میں، ملٹن انگریزی میں، یا ہومر یونانی میں، یا کالی داس سنسکرت میں ایسے ہوئے کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہو گیا تو کوئی تعجب کی جگہ نہیں۔

خدا کے کلام معجز کی تعریف میں میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ اسباب متعارفہ کے توسط کے بدون صادر ہونا چاہئے کیا ان لوگوں کی باقاعدہ تحصیل علوم، استادوں کیساتھ طویل ملازمت وہمنشینی، وسیع مطالعہ، مدتوں کی مشاقی اور جد وکد اُن کے جاننے والوں سے مخفی ہے؟ اور کیا فائق کلام بولنے یا لکھنے کے لئے یہ ظاہری اسباب نہیں ہیں؟ اگر ہیں اور ضرور ہیں! تو اُن کے کلام کا فائق ہونا بلا سبب متعارف کے ظاہر نہ ہوا بلکہ اتنی خاک چھاننے اور مصیبت بھگتنے کے بعد اگر ان کا کلام ایسا نہ ہوتا تو خلاف عادت ہونیکی وجہ سے موجب تعجب ہو سکتا تھا لہذا فیضی کی تفسیر کا ایک خاص صنعت بے نقط ہونے میں تفوق محل تعجب نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ جس نے کتاب اور کاغذ، قلم، دوات کو چالیس برس تک ہاتھ نہ لگایا، نہ کسی درسگاہ میں قدم رکھا، اس نے وہ کتاب دنیا کے سامنے پیش کی کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اُس کے اوپر قربان ہو جانا اپنا فخر سمجھے اور سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے بلکہ وہ اور اُن سے زیادہ باکمال ہستیاں اپنی ہستی اور کمالات کا سرچشمہ بھی اسی نور مجسم اور اسی کتاب مقدس کو سمجھتے ہیں۔ دیکھو خود حضرت سعدی بوستاں کے دیباچہ میں قرآن لانیوالے پیغمبر صلعم کی نسبت کیا فرماتے ہیں۔ اشعار

خلاف پیمبر کسے رہ گزید	کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید	مپندار سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز برپئے مصطفےٰ	کلیمے کہ چرخ فلک طور اوست	ہمہ نورہا پرتو نور اوست
یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست	کتب خانہ چند ملت بشست	بلند آسماں پیش قدرت خجل
تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل	تو اصل وجود آمدی از نخست	دگر ہرچہ موجود شد فرع تست

دانم کدامیں سخن گویمت — کہ والاتری زانچہ من گویمت — ترا عز لولاک تمکین بس ست
ثنائے تو طٰہٰ ویٰسیں بس ست — چہ وصفت کند سعدی ناتمام — علیک الصلوٰۃ ای نبی والسلام

اور فیضی جس کو قرآن کے مخالف بطور ایک غیر مجروح گواہ کے پیش کرتے ہیں اپنی تفسیر کی ابتدا میں اس نبی امی کی کتاب کو خدائی کلام مانتے ہوئے اور اس کے سامنے تمام علوم و کتب کو (خواہ فیضی کی ہوں یا سعدی کی) ہیچ بلکہ محض دردِ سر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے۔

العلوم کلها صداع الا علم کلام اللہ و کلام اللہ لا عدّ لمحامدہ ولا حد لمکارمہ ولا حصر لرسومہ ولا احصاء لعلومہ وما علم علوم کلام اللہ کلها احدٌ الا اللہ و رسولہ واولو العلم ما علموا الا اعدادا

کلام اللہ کی معلومات کے علاوہ تمام علوم دردِ سر ہیں اور کلام اللہ کے محامد کی کوئی تعداد نہیں نہ اُس کے مناقب کی کوئی انتہا ہے اسکی صداقت کے نشان غیر محصور اور اُس کے علوم بیشمار ہیں جو علوم کلام اللہ میں موجود ہیں اُن سب پر سوای خدا اور اُس کے رسول صلعم کسی کا احاطہ نہیں۔ تمام اہل علم کو جو کچھ ہاتھ آیا وہ ایک محدود حصہ ہے۔

پس جب فیضی اور سعدی بھی خود اپنے اقرار کے موافق اس نبی امی صلعم کے دبستان علم و حکمت میں ایسے ہیں جیسا کہ ایک شیرخوار بچہ سمندر کے کنارہ پر لیٹا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا ہو جس کے ہاتھوں کو کبھی کبھی ایک آدھ بوند پانی کی لگ جاتی ہو تو اب سعدی کی گلستاں یا فیضی کے کلام کو کلام اللہ کے مقابل لانا نہ صرف فیضی اور سعدی کا استہزا اور شاہد کی ضمیر کے خلاف شہادت دلانا ہے۔ بلکہ حد درجہ کی بے حیائی سے مدعی سُست اور گواہ چست کے طور پر اپنے آپ کو ذلیل اور رسوا کرنا ہے۔ علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ کیا فیضی اور سعدی نے یہ آواز بھی لگائی تھی کہ تمام دنیا مل کر میری کتاب کی کلاً یا جزءً مثال پیش کرے اور کیا پھر یہ دعوی بھی کیا کہ وہ ہرگز پیش نہ کر سکے گی۔ کیا انہوں نے کسی ایک آدمی کو بھی اپنے مقابلہ کے لئے ابھارا، عار دلائی، مجبور کیا کہ وہ ناچار سامنے آئیں اور ایسے سامان مہیا کئے کہ ان کو خواہی نخواہی کشاں کشاں سامنے آنا پڑتا اور وہ

مجبور ہوتے کہ فیضی اور سعدی کے کلاموں کا معارضہ کریں اور فرض کرو کہ سعدی وغیرہ تحدی اور مبارزہ بھی کرتے اس پر بھی کوئی میدان میں نہ آتا تو یہ بھی عجز کی دلیل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ممکن تھا کہ دنیا ان کا مقابلہ کرنے میں کوئی عظیم نفع، یا نہ کرنے میں کوئی عظیم نقصان نہ سمجھتی اور اس لیئے اس دعوے سے بے التفاتی اور استغناء برتتی۔ مگر برخلاف اس کے قرآن نے شروع ہی سے دعوی کیا کہ میرا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ غیرت دلائی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ چابک ۲ مار کر معارضہ کے لیئے کھڑا کیا۔

قرآن کیطرف سے مقابلہ کا پُر زور چیلنج

اور کہا کہ میرے جیسی ایک چھوٹی سی سورت سب ملکر بنا لاؤ اور اسی پر فیصلہ ہے۔ اگر نہ لا سکو اور ہمارا دعوی یہ بھی ہے کہ کبھی نہ لا سکو گے تو پھر مجھے خدا کا کلام تسلیم کرو۔ ورنہ اُس ابدی عذاب سے ڈرو جو منکرین کیلئے تیار ہے۔ اب دیکھئے کہ چیلنج کس زور کا تھا اور کتنے بھاری نفع یا نقصان کا سودا تھا۔ کیا ایسی حالت میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ لوگوں نے توجہ نہ کی ہوگی یا پوری ہمت اور قوت سے مقابلہ کے لیئے نہ نکلے ہوں گے۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ پوری توجہ اور پورا اعتنا کیا گیا۔ کیسے کہا جائے کہ توجہ نہ کی گئی ہوگی جب کہ آپ کے پیچھے پیچھے آدمی دوڑتا تھا کہ اے لوگو یہ مجنون ہے، اس کی بات نہ سنو تاکہ آپ کا اثر کہیں جمنے نہ پائے آپ کی ہلاکت کی کوشش کی گئی۔ آپ پر ہر قسم کے حملے کئے گئے۔ آپ کے قاتل کے لیئے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہوا۔ اور جب آپکا اثر برق رفتاری سے بڑھتا گیا۔ اور آپ کی صداقت وحقانیت اور صبر واستقامت کو دیکھ کر ہزارہا نفوس آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپ کے حریفوں کے خاص خاص لوگ بھی ان سے ٹوٹ ٹوٹ کر آپ کے حلقہ بگوش غلام بن گئے۔ خاندان کے خاندان داخل اسلام ہونے لگے۔ بعض بڑے بڑے متمول اور معزز لوگ عیش وعشرت

چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچے۔ پیارے پیارے بچوں اور عورتوں کو خیر باد کہکر فقیرانہ حالت میں نہایت بے سروسامانی کیساتھ آپ کے قدموں پر آپڑے اور ایسی سخت کٹھن اور خطرناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے کہ بشر سے اس کا تحمل سخت دشوار تھا۔ تو آپ کی مخالفوں نے غیظ و غضب سے بیتاب ہو کر جنگ و جدال اور معرکہ آرائی شروع کر دی۔ تلواریں اُٹھائی گئیں، صف آرئیاں ہوئیں، خون کی ندیاں بہائیں، جانیں گنوادیں، خویشوں اور عزیزوں کے سر کٹوائے، مال و متاع کو برباد کیا، تاکہ کسی نہ کسیطرح محمد صلعم کو مغلوب کریں ادھر سے بہت سہل آسان طریقہ مغلوب بلکہ اثر کے کلیتہً معدوم کرنے کا یہ بتایا گیا کہ صرف تین آیت کی برابر ایک چھوٹی سی سورت اسی شان کی لے آؤ جس شان میں قرآن تمہارے سامنے ہے۔ تو ہم خود بخود تمام تحریک کو ختم کر کے اپنی جماعت بلکہ اپنے آپ کو بھی تمہارے حوالہ کر دیں گے پھر مقابلہ کی اس آسان اور سہل ترین تدبیر کیساتھ اور بھی رنگارنگ سہولتیں بلکہ ہر ممکن آسانی بھی اُن کے لئے بہم پہنچادی۔ چنانچہ جب چیلنج دیا تو یہ نہ کہا کہ حضرت محمد صلعم کے مقابلہ میں ان جیسے ایک امی کو منتخب کرو بلکہ سب کے سب ملکر جتنے فصیح و بلیغ تعلیمیافتہ قبائل ہیں سب جمع ہو جاؤ۔ اتنے پر بھی بس نہیں، تمام دنیا کے انسانوں کو بھی جمع کر لو۔ بلکہ انسانوں کیساتھ دوسری مخلوق کو بھی شامل کر کے ایک سورۃ بنالاؤ تو نہ تلوار اُٹھانے کی ضرورت ہوگی، نہ خون بہانے کی حاجت باقی رہیگی نہ سلطنتیں اور سرداریاں تباہ ہونگی، نہ سازشیں کرنا پڑیں گی اور ساری تدابیر اسی ایک سہل بات پر ختم ہو جائینگی پہلے گذر چکا ہے کہ وہ اسقدر بولنے والے تھے کہ بولتے ہیں اور زبان کی فصاحت میں اپنے سوا تمام دنیا کو گونگا کہتے تھے جو صاف دلیل ہے کہ اُن کے پاس مقابلہ کیلئے اس سے بڑھکر اور کوئی چیز آسان اور سہل نہ تھی، مگر ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ دماغ مفلوج ہو گئے جوارح معطل ہو گئے، لیکن اس سہل ترین اور فیصلہ کن مقابلہ کی تاب نہ لا سکے۔

لقلنا مثل ھذا کا جواب

کبھی کبھی زبان سے یہ بھی کہتے تھے کہ:-

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ | اگر ہم چاہتے تو اس جیسا کلام کہدیتے۔

یعنی نہ ہم نے چاہا نہ کہا۔ مگر کیوں نہ چاہا؟ اس لئے کہ اپنی عزت اور آبرو اور قرآن کے سامنے اپنے عجز اور کمزوری کی پردہ پوشی صرف اسی صورت میں دیکھی۔ اگر وہ جھوٹ موٹ کہدیتے کہ یہ ہمارا کلام قرآن جیسا ہے تو کہنے والے کی زبان دانی اور فصاحت اور تصدیق کرنیوالوں کی سخن شناسی اور سخن فہمی پر ایسا سخت بدنما داغ لگتا کہ وہ کسی بزم سخن اور محفل ادب میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے اور دنیا ان کا تمسخر اڑاتی۔ اسوجہ سے یہ ہمت کسی نے نہیں کی بلکہ جب مضطر ہوئے تو یوں ٹالدیا کہ اگر ہم چاہتے تو کہدیتے مگر ہم نے چاہا ہی نہیں لیکن اس کا فیصلہ ہر عاقل خود بخود سابقہ واقعات کو ملحوظ رکھکر کر سکتا ہے کہ کیا انہوں نے چاہا یا نہیں چاہا۔

بھائیو! کیا یہ ممکن ہے کہ خود تمام مصیبتیں برداشت کریں اور دوسروں کو بھی ہر ایک مصیبت میں ڈالیں، قرآن پڑھنے والوں کے خلاف بادشاہوں کے پاس جاکر مدد مانگیں، ہر قسم کی سازشیں کریں، لوگوں کو قرآن سننے سے روکیں اور خود اقرار کریں کہ اس آواز سے ہماری عورتیں اور بچے مفتون ہوئے جاتے ہیں۔ قرآن ان کے مذہبوں پر ایسی کاری ضرب لگائے، ان کی سرداریوں کو خاک میں ملادے، ان کے کبر و نخوت کے طلسم کو توڑ دے، ان کی معبودوں کی حکومت میں زلزلہ ڈالدے، اُن کے جتھے توڑ ڈالے، ان کی قوتیں پراگندہ کر ڈالے، بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے، میاں کو بیوی سے، دوست کو دوست سے، غرض آدمی کو کل محبوب چیزوں سے چھڑا کر صرف اپنا ہی والہ و شیدا بنالے، مگر وہ برق زبانی اور شیوا بیانیوں کے مدعی زبانیں سی کر اور لبوں کو بند کرکے چپ بیٹھے رہیں۔ اور باوجود ایسے عذب البیان اور قادر الکلام ہونے کے دو چار جملے بنانے کی خواہش بھی

نہ کریں۔ بیشک ہزیمت خوردہ اور درماندہ آدمی بدحواس ہوکر ایسا ہی کہا کرتا ہے۔

قرآن کسی ایک آدمی یا کمیٹی کا بنایا ہوا کلام نہیں

جب کوئی بات نہ بن پڑتی تھی اور قرآن کے علوم کو محمد امی صلعم کے حالات سے تطبیق نہ دیسکتے تو کہتے انما یعلمہ بشر، محمد صلعم کو قرآن کوئی دوسرا آدمی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہ اشارہ ایک شام کے نصرانی کیطرف تھا۔ اس کا جواب بھی قرآن نے ایسا دیا کہ دنیا پر واضح ہوگیا کہ یہ مقولہ بھی نہایت بے بسی کی حالت میں اُن سے صادر ہوا تھا۔

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ اَعْجَمِیٌّ وَّھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ۝	یعنی یہ لوگ کجروی سے جس شخص کیطرف قرآن کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہاں ایک روشن اور فصیح زبان عربی کے مقابلہ کا چیلنج دیا جارہا ہے۔

جس سے بڑے بڑے قریشی عرب جان چراتے ہیں وہ عجمی غلام اُسے کیا جانے۔ کبھی کبھی بالکل ہی بدحواس ہوکر کہہ اٹھتے تھے۔

اِنْ ھٰذَآ اِلَّآ اِفْکُ اِفْتَرٰہُ وَاَعَانَہٗ عَلَیْہِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۝	یہ قرآن اس کے سوا کچھ نہیں کہ (معاذ اللہ) محمد صلعم کی اختراع و گھڑنت ہے، جسکی تصنیف میں دوسری جماعت نے اسکی مدد کی ہے

دیکھو اسقدر مذبوحی حرکات ہیں۔ بیساختہ زبانوں سے نکل جاتا ہے کہ ایک انسان سے ایسا کلام ممکن نہیں کہ بن پڑے۔ ہو نہ ہو یہ کمیٹی کا کام ہوگا۔ اس کا جواب بھی مُسکت اور دنداں شکن دیتے ہوئے فرمایا۔

فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝	ارے ایسا ظلم اور دن دہاڑے ایسا سفید جھوٹ۔

اگر بالفرض ہمارے پاس کمیٹی ہے تو تم اس سے زیادہ آدمیوں کی کمیٹی بنا سکتے ہو تم کو تو تمام جن وانس کی کمیٹی بنانے کی اجازت دی جارہی ہے۔ پھر جب تمام انسانوں کے جمع کرنے کی تم کو اجازت دی گئی تو تم ہم سے دعوی کیسا تھا اس کمیٹی کے تمام افراد بھی

IND. INST. OF ISLAMIC STUDIES
LIBRARY
32027

اگر تمھیں معلوم ہوں مانگ لو جو تمھارے کہنے کے موافق ہمارے پاس ہے اس لئے کہ وہ بھی انسانوں میں داخل ہیں جن کے جمع کرنے کی تم کو مہلت دی گئی ہے۔ باوجود اسقدر وسعت اور آسانی بہم پہنچانے کے بھی اگر مقابلہ کلام ایزدی کا نہ کر سکے اور نہ کر سکو گے، اور یہ بھی مطالبہ نہ کیا کہ تم فلاں فلاں آدمی کو ہمارے ساتھ دیدو جن پر تم کو خیال ہے کہ وہ کمیٹی کے ارکان ہیں تو سمجھ لو کہ یہ محض شرارت و ظلم اور دروغ بے فروغ ہو گا کہ قرآن کی تصنیف کسی مجہول الحال کمیٹی سے منسوب کرتے رہو۔

قرآن کسی ایک شخص یا کمیٹی کا کلام نہیں ہوسکتا۔

پھر کیا کسی کمیٹی کا پنچایتی کلام ایسا ہوسکتا ہے؟ آپ نے بڑے بڑے فصیح البیان اور عمدہ بولنے والے بھی دیکھے ہوں گے۔ کیا کوئی ایسا لکچرار آپ کی نظر میں ہے، جو ہر ایک مضمون پر یکساں بولنے کی قدرت رکھ سکتا ہو۔ کوئی آدمی ہر مضمون کے بیان پر یکساں قدرت نہیں رکھ سکتا، بلکہ بڑے بڑے قصیدوں میں دو ہی چار اشعار منتخب ہوتے ہیں اسلئے کہ کسی متکلم کو ہر مضمون پر پوری قدرت نہیں ہوتی چنانچہ علمائے ادب کا اعتراف ہے کہ امرؤ القیس گھوڑوں کی تعریف اچھی کرتا ہے، نابغہ خوف و خشیہ میں، اعشی شراب کی طلب اور تعریف میں، زہیر رغبت و رجاء میں اچھا لکھتا ہے جیسے نظامی و فردوسی رزم و بزم میں، سعدی وعظ و پند میں تفوق رکھتا ہے۔ لیکن دوسرے فن میں جا کر ان کی ساری جولانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

بوستاں میں ایک جگہ جنگ کی کہانی آگئی، وہیں سعدی کی زبان سُست پڑ گئی۔ بوستاں کے پانچویں باب میں اس حکایت کو دیکھ لو کہ نظامی اور فردوسی کے مقابلہ میں سعدی کا کلام کسقدر پھیکا ہے۔ کیونکہ رزمیہ کلام لکھنا سعدی کا فن نہیں تھا۔ کسی مشہور سے مشہور شاعر کا دیوان، یا کسی مسلم سے مسلم عالم اور حکیم کی کتاب کیف ما اتفق اٹھا کر پڑھ جاؤ، اول سے آخر تک یکساں زور قائم نہیں رہ سکتا۔ قرآن کو اول سے آخر تک دیکھو تو کسقدر مضامین مختلفہ کی رو ہے، جو کہ نہایت روانی، سلاست، آب و تاب اور شان و شوکت

سے بھر رہی ہے اور ہر مضمون کو کسقدر قوت اور جزالت و فصاحت کیساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ کہیں معاش کا بیان ہے۔ نکاح و طلاق کے قواعد کی تعلیم ہے۔ کہیں فرائض میت تقسیم کیجاتی ہے۔ کبھی نماز روزہ کا وعظ ہے، کبھی جہاد کا بیان ہے، لڑائی کے نقشے کھینچ جاتے ہیں، کہیں سنین ماضیہ کے تاریخی واقعات ہیں، کبھی دلوں کو رُلانیوالی پند و نصائح بیان کیجاتی ہیں، کبھی بہشت کا تنعم سامنے ہے، کبھی دوزخ کا عذاب، یہ سب کچھ ہے مگر طرز بیان میں کوئی سُستی نہیں، کمزوری نہیں، انحطاط نہیں، ہر موقع پر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس کے مقابلہ سے تمام جن و بشر عاجز ہیں اور ہر جگہ زبان پر آتا ہے کہ ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست۔

اول سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی طرح کا زور اور ایک ہی رنگ ڈھنگ اور سارے کلام کی یہ یکسانیت ہی پتہ دے رہی ہے کہ یہ کسی مخلوق کا، یا کسی کمیٹی کا کلام نہیں، بلکہ یہ اس کا کلام ہے جس کی صفات سب کی سب کامل، غیر متبدل، لازوال اور نقص و فتور سے منزہ ہیں:۔

وَلَوْكَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

اور اگر (قرآن) خدا کے سوا کسی اور کے پاس سے (آیا) ہوتا تو ضرور اس میں بہت سا اختلاف پاتے

خدائی کلام سی خدائی شان ٹپکتی ہی

پھر دیکھو اول سے آخر تک تمام مضامین نہایت شوکت اور کبریا و عظمت بھرے الفاظ اور زور دار لہجہ میں ادا کئے گئے ہیں۔ اگر یہ کلام اس بشر کا ہوتا جس کی زبان سے ہم تک پہنچا تو اس کی مظلومیت اور دشمنوں کی اُس پر مختلف چڑھائیاں تو سب کو معلوم ہیں، ناممکن تھا کہ اس کلام کے اندر کہیں نہ کہیں ظالموں کے سامنے تملق، خوشامد، مداہنت، بیچارگی اور مرعوب ہونے کے آثار موجود نہ ہوتے جنکا نام و نشان بھی قرآن میں اول سے آخر تک موجود نہیں۔ بلکہ جس زور و شور اور خدائی شوکت سے شروع ہوا اُسی تزک و احتشام اور زور کیساتھ ختم بھی ہوا

اگر کسی نے قرآن کا معارضہ کیا ہوتا تو اسکا ضائع ہونا محال تھا

ممکن ہے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ شاید قرآن کی نظیر پیش کی گئی ہو مگر وہ باقی نہ رہی ہو تو میں کہتا ہوں کہ ایک مظلوم اور بے یار و مددگار کا کلام تو اب تک برابر موجود رہی مگر عرب کے بڑے بڑے رئیسوں بلکہ دنیا کے تمام باطل مذاہب و ملل کی دلی تمنا جس کلام سے پوری ہو جاتی وہ باقی نہ رہے۔ کیا اسے عقل سلیم باور کر سکتی ہے؟ پھر جب کہ موافقوں کی تعداد سے مخالفوں کی تعداد کہیں زیادہ ہو، روی زمین پر دشمن پھیلے پڑے ہوں جو ہر آن ایسی چیز کے تجسس میں آغاز اسلام سے آج تک رہی جو قرآن کے اس دعوی کو ٹھنڈا کر دے۔

میسلمہ کذاب نے قرآن کے سامنے کچھ منھ چڑایا تھا وہ تاریخ میں موجود ہے۔ باوجودیکہ وہ بہت زیادہ گندا اور بدبودار اور رکیک اور خلاف تہذیب کلام ہے مگر وہ بھی اب تک باقی ہے۔ یعنی

الم تران اللہ خلق النساء افراجا فنجعلھن ایلاجا

مورخوں نے لفظ لفظ کو محفوظ رکھا۔ جب ایسی رکیک اور ناشائستہ کلام کو بھی ضائع نہ ہونے دیا تو کسی اچھے کلام کو اور وہ بھی ایسا اچھا جو بفرض محال قرآن سے بھی اعلیٰ اور برتر ہو کس طرح ضائع کیا جا سکتا تھا۔ اگر قرآن سے بہتر فصیح اور بلیغ کلام ادبی لٹریچر سے گم ہو گیا تو قرآن کا یہ دوسرا اعجاز ہوگا کہ وہ اپنے سے غالب اور قوی کو بھی اس طرح فنا کر ڈالتا ہے کہ آج صفحہ ہستی پر کوئی اس کو زبان پر لانیوالا بھی نہیں۔

عربی نہ جاننے والے کس طرح قرآن کی فصاحت کو پہچان سکتے ہیں

شاید کہو گے کہ ہم تو عربی نہیں جانتے ہماری سمجھ میں کس طرح قرآن کا اعجاز آئے؟ تو یاد رکھو کہ ہر فن میں اس کے اساتذہ اور ماہرین کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر عربی زبان آج بھی زندہ زبان ہے۔ سنسکرت کی طرح مردہ نہیں۔ بیروت مصر

قاہرہ وغیرہ میں اس وقت بھی بہت سے ایسے نصاریٰ اور یہود موجود ہیں جن کے مقابلہ میں بڑے بڑے ادیب قلم نہیں اٹھا سکتے۔ انہوں نے عربی زبان میں عجیب و غریب کتابیں لکھی ہیں عربی لغت تیار کی ہے۔ ہزارہا چھوٹے چھوٹے رسائل اور موٹی موٹی کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں اگر تم نہیں جانتے تو جاؤ ان ہی سے کہو کہ ایک سورۃ قرآن کے جواب میں بنا کر دیدیں۔ وہ بھی اسلام کے دوست نہیں بلکہ تم سے بڑھ چڑھ کر اُس کے دشمن ہیں۔ ہر ممکن سعی سے وہ اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں مگر یہ حوصلہ آج تک نہ کسی فرد کو ہوا، نہ کسی انجمن کو قرآن کے چہاردہ صد سالہ چیلنج کو منظور کرتا۔ وہ اسی میں اپنی لیاقت اور عزت سمجھتے ہیں کہ اسطرف کا قصد نہ کریں۔ تم بھی لاکھوں روپیہ شدھی سبھاؤں پر صرف کر رہے ہو جسطرح عیسائی اپنے مشنوں پر کروڑوں روپیہ لگاتے ہیں بغداد کی آریہ سماج کو لکھو کہ وہ وہاں کے مشنوں کو یہ مشورہ دے کہ سب ملکر قرآن کے جواب میں چند سطر لکھکر شائع کر دیں مگر ہاں بعد میں ان کی فضیحت اور رسوائی کا ذمہ دار تم کو ہونا پڑیگا۔ اس سے بڑھکر یہ ہے کہ کوئی مضمون قرآن ہی سے لیلو اسیقدر مزایا اور لطائف کی رعایت کیساتھ اپنی عبارت میں اُس کو ادا کر دو جسقدر مزایا اور لطائف قرآن کی عبارت میں مرعی ہیں قرآن کے پیرو تم کو بتلا دینگے کہ چراغ مردہ کو نور آفتاب سے کیا نسبت ہے۔

قرآن کا اصلی اعجاز اوس کی انتہائی درجہ کی بلیغانہ نظم و اسلوب میں ہے

نزول قرآن کے وقت بعض لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ سب مخترعات ہیں

وَیَقُوْلُوْنَ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا

جواب یہ ہے کہ (قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ) اچھا اگر ہدایت کی باتیں نہ سہی تو تم بھی ایسی ہی مفتریات یعنی گھڑی ہوئی باتیں ایسی طرز بیان میں لے آؤ۔

محض ایک شاعرانہ مضمون کے ادا میں بھی بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی خیال ہے جسکو شاعر ایک رنگ سے ادا کرتا ہے۔ دوسرا اسی میں ایسی لطافت پیدا کرتا ہے کہ پہلے شاعر کا کلام اس کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے۔

ذوق ملک الشعراء نے ایک غزل میں لکھا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

اسی خیال کو دوسرا ایک شاعر مکند رام (جس کا نام بھی شاید کسی کو معلوم ہو) ایسی لطافت کیساتھ ادا کرتا ہے کہ سخن شناسوں کو ناچار اسی کے حق میں فیصلہ دینا پڑا۔ کہتا ہے۔

دل کی نہیں تقصیر مکند آنکھیں ہیں ظالم
یہ جاکے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہوتا

دیکھلو ذوق کا کلام مکند رام کے مقابلہ میں کیسا پھیکا پڑگیا ہے۔ اسی طرح فردوسی نے کہا تھا۔

جہاں را بلندی و پستی توئی
ندانم چہ آنچہ ہستی توئی

نظامی نے اس کے مقابلہ میں فرمایا:۔

پناہ بلندی و پستی توئی
ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

پہلے مصرع میں پناہ اور دوسرے میں نیستند نے نظامی رح کے شعر کو فردوسی کے شعر سے بلیغ اور بہت صاف کر دیا ہے۔ فردوسی نے لکھا تھا:۔

زہے بارگاہِ زافراسیاب
زمشرق بمغرب کشیدہ طناب

نظامی رح کہتے ہیں:۔

زہے بارگاہِ کہ چوں آفتاب
زمشرق بمغرب کشیدہ طناب

دیکھو چوں آفتاب نے شعر کو کیسا مبرہن اور لاجواب بنا دیا ہے اور زافراسیاب کی ز کی ضرورت بھی نہ رہی۔ اردو میں قمر کا شعر ہے:۔

مرض ہجر مرا خاک ہوا اچھا تم سے
خود مسیحا ہو اجی اور ہیں بیمار آنکھیں

جوہر نے اس مضمون کو کسقدر خوبی سے ادا کیا ہے:۔

آپ سے اپنا مداوا بھی نہیں ہو سکتا
کیسے عیسیٰ ہو کہ جب دیکھو ہیں بیمار آنکھیں

آنکھوں کیساتھ لفظ دیکھو دیکھنے کے قابل ہے۔ ناسخ کہتا ہے:۔

شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی
عمر ہوئی کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

غالب نے ں کو کسقدر چُست اور لطیف بنا دیا۔ کہتے ہیں:۔

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

ذوق نے کہا تھا۔ ہزار لطف جو ہیں ہر ستم میں جاں کیلئے
ستم شریک ہوا کون آسماں کیلئے

کسی اُستاد نے اسی مضمون کو اس طرح لکھا ہے:۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

سخن شناس سمجھتا ہے کہ دوسرا شعر اول سے باعتبار پاکی الفاظ و حُسن ادا و خوبی ترکیب بالاتر ہے اور الفاظ معشوق و پردۂ زنگاری نے اُس کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔ مومن خاں کہتے ہیں:۔

خونبہا قاتل بے رحم سے مانگا کس نے
کہ فرشتے مجھے یاں داغ درم دیتے ہیں

اس کے مقابلہ میں ذوق کا کلام ملاحظہ ہو:۔

کہتی تھی ماہی بریاں کہ دبیران قضا
داغ دیتے ہیں اُسے جسکو درم دیتے ہیں

ظاہر ہے کہ شعر اول میں داغ درم دینا اور خونبہا مانگنا محض ادعا ہے اور دوسرے شعر میں داغ دینا و صاحب درم ہونا ثابت ہے دیکھو یہاں داغ اور درم کا مضمون لیکر ایسی طرح ادا کیا کہ پہلے کی نسبت شعر نہایت بلیغ ہو گیا۔

یہ چند نمونے ہم نے اس لئے پیش کئے ہیں کہ یہ ثابت ہو سکے کہ بعض شاعرانہ تخیلات اور مفروض و مخترع مضامین کے ادا میں بھی ترکیب کی بندش اور الفاظ کی چستی اور روانی اور دیگر لطائف و مزایا کی رعایت سے کسقدر فرق اور تفاوت ہو جاتا ہے۔ پس ہم اجازت دیتے ہیں کہ آج بھی سارے فصیح و بلیغ ملکر ایک دو قصے کہانیاں ہی ایسی عبارت میں پیش کر دیں جو قرآن کی کسی چھوٹی سی چھوٹی سورت کے مقابلہ میں لطیف تر اور فصیح تر ہو۔ کیا اسقدر سہولتیں عطا کرنے کے بعد بھی اگر مقابلہ سے عاجز رہے تو یہ اس کی دلیل نہ ہو گی کہ یہ کلام دنیا کے خالق اور مالک کا ہے۔

خدائی کام سے توحید اور خدائی کلام سے رسالت کا ثبوت

میں نے کہا تھا کہ خدائی کام بندوں کے کام سے اس طرح ممتاز ہوتا ہے کہ بندوں کو اس

جیسے کام پر کوئی دسترس نہیں ہوتی اسیطرح اللہ کا کلام بھی بندوں کے کلام سے الگ پہچانا جاتا ہے کہ ویسا کلام بنانا بندوں کے اختیار اور قبضہ میں نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے ان دونوں مضامین پر ایک ہی آیت میں متنبہ فرمایا ہی جس کا خلاصہ یہ ہی کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ
وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي
جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَ
أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ
رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

تم کو اور تمہارے اسلاف کو اور تمہارے لئے زمین کا فرش آسمان کی چھت اور بادلوں کی بارش، درختوں کے پھل جس پروردگار نے بنائے اسی کی عبادت کرو اور اس کا مثل مت قرار دو۔

یعنی جب خدا کے کاموں کا کوئی مثل نہیں لا سکتا تو خدا کو بھی بے مثل ماننا ضروری ہے۔ اسیطرح خدائی کلام کا مثل لانے سے جب سب عاجز ہوں تو اُس کو خدا ہی کا کلام یقین کرنا ضروری ہو اور اسی لئے جو بندہ اس کلام کو لایا ہے اس کی تصدیق بھی لازم ہوئی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا
فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ
مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝

اور وہ جو ہم نے اپنے بندہ (محمدؐ) پر (قرآن) اُتارا ہے اگر تمکو اس میں شک ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے اور (اپنے اس دعوی میں) سچے ہو تو اس جیسی ایک سورۃ (تم بھی بنا) لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بلالو۔

ممکن ہے کسی کو یہ خلجان رہے کہ خدائی کاموں کو ہم بظاہر کسی فاعل مختار سے صادر ہوتے نہیں دیکھتے بخلاف اس کے خدائی کلام کو ہم ایک ذی شعور اور باختیار متکلم انسان کی زبان سے سنتے ہیں اسی لئے ہمارے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کلام خواہ کتنا ہی اعلیٰ و ارفع ہو ہم اُسے متکلم کیطرف منسوب کردیں جس کی زبان سے ہمارے کانوں تک پہنچ رہا ہے۔

لیکن اس کا یہ شبہہ محض سطحی ہے۔ غور کیجئے کہ اگر ایک چھ سات سال کا دیہاتی بچہ آپ کے سامنے آئے جس کو کسی نے گلستاں یا بوستاں کا ایک باب، یا عرفی یا قاآنی کا ایک

قصیدہ، یا حافظ شیرازی کی ایک غزل یا کسی اور بڑے عالم یا حکیم یا شاعر یا خطیب کا کوئی منتخب کلام یاد کرا دیا ہو وہ آپ کے روبرو نہایت صاف و صحیح لب و لہجہ میں اُسے زبانی ادا کر دے اور فرض کرو کہ آپ کو یہ تعیین نہ ہو کہ اصل کلام کس کا ہے تو کیا واقعی اس صورت میں آپ محض اتنا دیکھ کر کہ یہ کلام اُسی بچہ کے کام و دہن سے نکل رہا ہے یہ یقین کر لیں گے کہ بیشک یہ کلام اُسی بچہ کا تصنیف کیا ہوا، اور اُسی کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ بچہ خود بھی کہہ رہا ہو کہ جناب یہ میرا کلام نہیں ہے۔ اور نہ میں ایسی قابلیت رکھتا ہوں کہ ایسا کلام بنا سکوں اور اُس کے ساری بستی والے بھی موافق اور مخالف گواہ ہوں کہ اس بچہ نے کبھی قبل ازیں ایسی اعلیٰ تعلیم اور صحبت نہیں پائی، جو ایسا کلام تصنیف کرنے پر قادر کرے۔

کیا آپ ان سب حالات کی موجودگی میں بھی برابر یہی کہتے چلے جائیں گے کہ نہیں یہ سب اسی کی تصنیف ہے کیونکہ بچہ ذی شعور، با اختیار، بولنے والا انسان ہے۔ اور اسی کے حلقوم سے ہم یہ آواز سن رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پرلے درجہ کا بلید، احمق، جاہل اور متعصب بھی اس کی جرات نہ کریگا۔ تو ثابت ہوا کہ محض اسقدر دیکھ لینے سے کہ ایک کلام ایک شخص کے کام و دہن سے نکل رہا ہے یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کلام اُسی کا ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ اپنے سے نفی بھی کر رہا ہو۔ اور اُس کا ایک جھوٹ بھی عمر بھر ثابت نہوا ہو اور اس کے حالات زندگی بھی نفی کی تائید کرتے ہوں اور خود اُس شخص کے کلام کا بڑا بھاری ذخیرہ (احادیث) بھی محفوظ اور مدوّن ہو اور اس میں کا کوئی حصہ باوجود غایت درجہ کی فصاحت و بلاغت کے اس کلام کے کسی حصہ کی ہمسری نہ کر سکتا ہو اور ساری دنیا ویسا کلام پیش کرنے سے تھک چکی ہو۔ اندریں حالات آپ ہی فیصلہ کریں کہ ایک ایماندار طالب حق کو کیا یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ:۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود | گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

لاریب اس کی یہی شان ہے:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى | بلکہ یہ (قرآن) جو پڑھکر سناتے ہیں وحی (آسمانی) ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے اور بلا شبہہ قرآن کا لانے والا وہی نبی ہے جس کی نسبت توراۃ میں سیکڑوں برس پہلے خبر دی گئی تھی کہ خدا اُس کے منھ میں اپنا کلام ڈالیگا۔

نزول قرآن کے وقت نبیؐ کی کیفیت

قرآن جس وقت اُترتا تھا یا بالفاظ دیگر جب خدا حضرت محمد صلعم کی زبان سے بولتا تھا اسوقت آپ کے حالات بھی عام تکلم اور خطاب کے حالات سے بالکل ممتاز اور جداگانہ ہوتے تھے۔ کیونکہ بشری کالبد کو خدائی صفت کا مظہر بننا پڑتا تھا اور تمام روحانی قوتیں اور ملکوتی طاقتیں جو موحی الیہ میں فطرۃً ودیعت کیجاتی ہیں اس مادی عالم سے یکسو ہو کر ملأ اعلیٰ اور عالم غیب کیطرف سمٹ جاتی تھیں تو بشری خصائص اور ملکوتی قوی کے تجاذب اور تصادم سے قدرتی طور پر ایسے وقت میں وہ آثار نبی موحی الیہ کے جسم پر طاری ہونے چاہئیں جو عام حالات واوقات سے مبائن ہوں چنانچہ سیرتِ نبوی اور احادیث کا مطالعہ کرنیوالوں سے یہ چیزیں پوشیدہ نہیں ہیں۔ باقی تمام اوقات میں جو مکالمات ومخاطبات نبی کریم صلعم کے ہوتے تھے ان میں ایسے آثار وعلائم کا نام ونشان نہ تھا کیونکہ اسوقت ایک بشر کا کلام تھا جو اسی کی زبان سے ادا ہو رہا تھا، گو جن علوم ومطالب پر وہ کلام مشتمل ہوتا تھا وہ کیسے ہی صادق اور عمیق بلکہ الہامی ہوں۔

قرآن کی تلاوۃ کا اثر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

جسوقت نبی کریم صلعم قرآن کی تلاوت فرماتے تھے یا کسی دوسرے سے سنتے تھے تو آپ خود بھی اسقدر متأثر ہوتے تھے کہ خود اپنے کلام کو پڑھکر اتنا متأثر ہونا عادۃً متصور نہیں، آپ کا چہرہ خوف سے متغیر ہو جاتا، آنکھیں بہنے لگتیں، گریہ طاری ہو جاتا، راتوں کو جب کہ مخلوق بستر استراحت پر آرام کرتی تھی آپ خدا کے سامنے کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے، حتیٰ کہ پاؤں سوج جاتے اور قدموں کا ورم دیکھکر لوگ رحم کھاتے اور آپ فرماتے افلا اکون عبدًا شکورا۔ ایک ہی آیت کو کبھی بار بار پڑھتے اور روتے تھے۔ غرض قرآن کا جو اثر آپ کی زبان سے سننے والے

صحابہ قبول کرتے تھے اُن سے زائد آپکا ہوتا تھا۔

ایک صاحب بصیرت جو خوف خدا کی ذرا سی بھی ٹیس دل میں رکھتا ہو اتنی ہی بات سے قرآن کی نسبت ایمان لاسکتا ہے کہ وہ محمد صلعم کی تصنیف نہیں ہے اور نہ وہ کسی ایسی بشر یا کمیٹی کی تصنیف ہی جن کا نام اور حال آنحضرت صلعم نے ساری عمر مخفی رکھا ہو۔

قرآن کا اثر سامعین پر کیا ہوا؟

قرآن نے اُس قوم پر کیا اثر ڈالا جس نے اُسے نو بنو اور تازہ بتازہ پیغمبر صلعم کی زبان مبارک سے سُنا تھا؟

اس سوال کا جواب تاریخ کے اُن درخشاں واقعات میں سے ہی جنکا اعتراف دوست اور دشمن ہر ایک کو کرنا پڑا ہی۔ دنیا نے جب سے جنم لیا، آسمان نے جب سے سایا ڈالا، زمین نے جب سے اپنی پشت پر اولاد آدم کو اُٹھایا۔ کبھی ایسا عظیم، ایسا سریع، ایسا محیر العقول انقلاب چشم فلک نے نہیں دیکھا ہوگا۔ جیسا بے مثال انقلاب عرب کی حالت میں بلاواسطہ اور سارے ربع مسکون کی روحانی حالت میں بالواسطہ اُس بیمثال خدا کے اُتارے ہوئے بیمثال قرآن کی بیمثال تعلیم سے نمودار ہوا۔

صاحب آیات بینات لکھتا ہی کہ قرآن حکیم ایک ایسے زمانہ میں اُترا جب کہ دنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں تھی اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمہ کی گئی جو سوای اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بداخلاقی اور نفاق اور جنگجوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے۔ مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے ان پر ایسی عجیب و غریب تاثیر کی کہ اُس سے ان کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں برسوں کے بھٹکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے سوتے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے جو مشرک تھے وہ موحّد ہوگئے، جو کافر تھے وہ ایمان لائے، جو بت پرست تھے وہ بت

شکن بن گئے، جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دکھانے لگے، جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا، خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں، دماغ نخوت و غرور سے خالی ہو گئے اور ان کے دل صبر و توکل حلم و بردباری زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے۔ آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست پاک طبیعت، راست باز نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا جن کی کوششوں سے شرک و بت پرستی کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی بند ہو گئی۔ اور اس کے بدلے ایک بیچوں و بیچگوں، بے شبہہ و بے نموں خدا کی منادی پھر گئی، بتوں نے عدم کا راستہ لیا، بتخانوں کا نشان مٹ گیا، آتشکدے ٹھنڈے پڑ گئے، تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا، اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔	حق ظاہر ہو گیا اور باطل مغلوب اور بلا شبہ باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے۔

کیا اس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشاں ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے رسول اور خدا ہی کیطرف سے مؤید تھے۔ ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کر دیتا اور ایسے جنگجو، ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے تھے، اخوت کے ایک رشتہ میں باندھ دیتا اور ان کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے ان کے دلوں کو ایسا صاف کر دیتا کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا۔ بلکہ دنیا میں ان کو اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنا دیتا۔

سرور کائنات صلعم کی ایسی عجیب و غریب تاثیر اور ایسے حیرت انگیز نتائج کو دیکھکر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرۃ سے خارج تھی، چنانچہ کوئی ان میں سے کہتا ہے کہ “وہ پیام جو آپ لائے وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا، جس کا مخرج وہی ہستی تھی جس کی تھاہ کبھی کسی نے نہیں پائی” کوئی لکھتا ہے کہ

قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ متعصب سے متعصب عیسائیوں کا یہ اقرار ہے کہ دین مسیحی کی ابتدا سے آنحضرت صلعم کے وقت تک کبھی حیوۃ روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی۔

خدا نے جس سے کلام کیا یعنی قرآن اوس پر اُتارا اس کی فہم و اخلاق کا کیا حال تھا؟

اب قرآن کے کلام الٰہی ہو سکنے پر ایک اور طرف سے بھی غور کرو۔ وہ یہ کہ خداوند اکبر نے جس کی زبان سے کلام کیا اُس کی فطرۃ کیسی تھی؟ پیدائشی طور پر اُس نے دل و دماغ کیسا پایا تھا، فہم کیسا تھا اخلاق کیسے تھے کس قسم کے ہوش و حواس، تدبیر و تیقظ، انسانی ملکات، باطنی خصائل، ظاہری شمائل پر وہ مفطور و مخلوق ہوا تھا؟

دنیا کے چھوٹے چھوٹے راجہ اور سلاطین بھی باوجودیکہ وہ ہم ہی جیسے انسان ہیں، تھوڑی سی فانی عزت اور ناپائدار خودداری کے تخیل میں ہر کس و ناکس کو منھ نہیں لگاتے۔ نہ ہر ایک کو اپنی مسند قرب و ہمنشینی پر جگہ دیتے ہیں۔ نہ ہر ایک کو ہمکلامی کا شرف بخشتے ہیں۔ نہ ہر ایک کی زبان سے بولتے اور تقریر کرتے ہیں۔ مخصوص اشخاص ہوتے ہیں جن کو مجالست و مکالمت اور ترجمانی کا حق دیا جاتا ہے۔ یا بطور معتمد خاص یا قائم مقام خاص کے نامزد کرتے ہیں۔ ہر انگریز وائسرائے نہیں بنا دیا جاتا، ہر ترک پاشا نہیں ہوتا۔ ہر سویلین کا یہ درجہ نہیں کہ وائسرائی سے بلا واسطہ گفتگو کر سکے۔ ٹھیک اسیطرح سمجھ لو کہ ہر ایک انسان خدا کا ہمکلم یا رسول یا نبی یا اُس احکم الحاکمین کا نائب السلطنۃ بنائے جانے کے قابل نہیں۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ] خدا جس جگہ اپنی پیغمبری کی امانت سپرد کرتا ہے وہ اس جگہ کے محفوظ اور قابل اطمینان ہونیکو بھی خوب جانتا ہے۔

اس بات کا تفصیلاً ذکر کرنا کہ کس قسم کے نفوس حق تعالے شانہٗ کی ہمکلامی سے مشرف ہو سکتے ہیں میرے لئے مشکل ہے اور وقت بھی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایسی لمبی بحث کو چھیڑ دوں

اور اپنی بضاعت اور کفایت کے قدر اس کے متعلق کتاب العقل والنقل میں عرض بھی کر چکا ہوں۔ لیکن اجمالاً اسقدر گذارش کر دینا مناسب ہے کہ جو شخص منصب نبوت پر فائز کیا جائے ضروری ہے کہ فطری طور پر اُس کی دماغی قویٰ اور قلبی ملکات اور عام اخلاقی حالات تمام اقران سے اعلیٰ وارفع ہوں، فہم و دانش، عزم و استقلال صبر و ثبات خلوص نیت۔ ہمدردی خلائق، محنت، جفاکشی اور خدا کی اطاعت و وفاداری کے جذبہ سے اس کا ظاہر و باطن لگا ہوا ہو۔ کوئی شخص یہ خیال نہیں کر سکتا کہ ان ملکات اور قویٰ کے فقدان کی صورت میں خدائے قادر و توانا جس کا علم ازلی تمام ماکان ومایکون کو محیط ہے، اپنی بھاری ذمہ داری اور نیابۃ الٰہیہ اور امانت عظیمہ کو کیف ما اتفق کسی معمولی انسان کے سپرد کر دیگا۔ قرآن کے لانیوالے کی سیرت (لائف) کو جب ہم اس معیار پر کستے ہیں تو ہم کو ناگزیر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آج تک جتنے آدمیوں کی نسبت ملہم اور مکلّم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے ان سب میں زیادہ اقدم و احق اور اس منصب جلیل کا باعتبار اپنی فوق العادۃ قوائے عقلیہ و عملیہ کے دنیا کا وہ سب سے بڑا انسان ہی ہو سکتا ہے جس کو ہم نبی امی اور پیغمبر عربی کے مشہور اور معروف لقب سے یاد کرتے ہیں۔ فداہ ابی و امی اللھم صل علیٰ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ اور حالاتِ زندگی اور حضور کی بعثت کا ایک ایک لمحہ ان ضخیم اور مستند کتابوں میں محفوظ ہے جن سے بڑھکر روایت کے ہاتھ میں کوئی قابل اعتبار اور باوثوق ذخیرہ نہیں ہے۔ آپ کے پیروؤں نے آپ کی سوانح زندگی اور تمامی اقوال و افعال اور حرکات و سکنات کو اسقدر اہتمام و استیعاب و دیانت، تیقظ اور شغف سے محفوظ رکھا کہ وہ ایک مستقل فن بن گیا۔ بلکہ اس فن سے پھر کئی فن نکل آئے۔ غالباً کسی امت نے اپنی آسمانی کتاب کی بھی حفاظت اتنی نہ کی ہوگی جسقدر امت محمدیہ نے اپنے پیغمبر کے حالات کی کی اور بیشک ایسے نبی کے حالات کی جو ابدی مذہب اور نہ منسوخ ہونیوالا کلام لیکر آیا ایسی ہی حفاظت ہونا چاہیئے تھی تا مرور دہور کے بعد بھی کوئی شخص

اس ہدایت کے قبول کرنے سے منہ نہ پھیر سکے جسے لیکر آپ تشریف لائے تھے اور یہ حیلہ نہ بنا سکے کہ ہم کو ملہم کے حالات ہی جب معلوم نہیں تو ہم کس طرح پورا پورا اطمینان کر سکتے ہیں کہ خدا کا کلام لانیوالا ویسی ہی عظمت و شان کا انسان تھا جو اس عہدہ جلیلہ کے لئے ضروری ہے حدیث اور سیر کی بیشمار کتابوں کی تلخیص میں اس جگہ نہیں کر سکتا۔ البتہ آنحضرت صلعم کی اعلیٰ فہم اور اعلیٰ اخلاق کے متعلق ایک دو چیزیں اپنے رسالہ الاسلام سے نقل کرتا ہوں جو اس موقع پر انشاء اللہ کفایت کریں گی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوۃ اخلاقی وعقلی

عرب کی جہالت، درشت مزاجی، گردن کشی کو کون نہیں جانتا۔ جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب اُن کے پاس آسمانی ہو نہ زمینی اور اُن کے اخلاق کا یہ حال کہ قتل و غارت وغیرہ ایک معمولی حرکت ہو، عقل و فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھا لائے اور پوجنے لگے۔ اور گردن کشی کی یہ صورت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں جفاکشی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک میں شاد و خرم زندگی گذار دیں۔ ایسے جاہلوں اور خود سروں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا چہ جائیکہ علم الٰہیات، علم معاملات، علم عبادات، علم اخلاق، علم سیاست مدن میں حکما نامدار بنا دیا یہانتک کہ دنیا نے اُن کی اور اُن کے شاگردوں کی شاگردی کی۔

ڈاکٹر گستاؤ لیبان کہتا ہے۔

”اس پیغمبر اسلام، اس نبی امی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے جس کی آواز نے“
”ایک قوم ناہنجار کو جو اسوقت تک کسی ملک گیر کے زیر حکومت نہیں آئی تھی رام کیا اور“
”اس درجہ پر پہنچایا کہ اُس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا اور اسوقت بھی“
”وہی نبی امی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگان خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے“

اگر انصاف کرو تو آپ کے حسن اخلاق کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ نہ کہیں

کے بادشاہ تھے نہ بادشاہ کے گھرانہ میں پیدا ہوئے تھے، نہ کچھ مال و دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا، نہ باپ دادا نے کوئی اندوختہ میراث میں چھوڑا تھا، نہ آپ کے پاس تنخواہ دار فوج تھی، نہ اہل وطن آپ کے ہمراہ تھے، نہ قبیلہ والوں کو آپ کے مذہب سے ہمدردی تھی۔ ایسی بیکسی اور بے بسی کی حالت میں آپ نے ان تند خو گنواروں کو ایک ایسی صدائے نامانوس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھکر اُسوقت ساری دنیا میں کوئی مکروہ آواز نہ سمجھی جاتی تھی اور نہ ایسی صدا دینے والے سے زیادہ اُن کے نزدیک کوئی ان کا دشمن اور بدخواہ سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ وہی لا الٰہ الا اللہ کی آواز تھی کہ جس نے دفعتہً تمام عرب میں تہلکہ ڈالدیا جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں بھونچال آنا شروع ہو گیا۔ اور جس کی چمک سے اس کفر و جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کوند گئی گویا وہ ایک زور وشور کی ہوا تھی جس کے چلتے ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھٹ گئے اور آفتاب توحید ابر کے پردے سے باہر نکل آیا۔ یا ابابیل رحمت تھی جس کی بوچھار نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھیوں کے پرخچے اُڑا دیئے اور خدا کے گھر کو اُن کی زد سے بچالیا۔ غرض کہ ایک ایسے بے یار و مددگار نے ایسی سخت قوم کو ایسی ظلمت کے زمانہ میں ایسے اجنبی مضمون کی طرف اُبھارا۔ اور تھوڑے عرصہ میں ان سب کو ایسا مسخر اور گرویدہ بنالیا کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کے لئے تیار ہو گئے۔ گھر باہر کو ترک کر دیا۔ زن و فرزند سے بگاڑ لی۔ مال و دولت کو سنگریزوں سے حقیر سمجھا، اپنے بیگانوں سے آمادہ جنگ و پیکار ہوئے کسی کو آپ نے مارا، کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے۔ پھر دو چار روز کا ولولہ نہ تھا، بلکہ آپ کے بعد اسی حالت پر استقلال کیساتھ جمے رہے۔ یہانتک کہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے، فارس و روم کو تہ و بالا کر دیا اور اس پر معاملات میں وہ شائستگی رہی کہ کسی لشکری نے سوائے مقابلہ جہاد کسی کی ایذا رسانی یا ہتک ناموس کو گوارا نہ کیا۔ یہ تسخیر اخلاق بتلایئے اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی سے ظاہر ہوئی ہے؟

یہ تو آپ کے اخلاق کی حالت تھی باقی آپ کی عقل و فہم کا نشان سب سے بڑا یہی ہے کہ آپ بذاتِ خود امی محض، جس ملک میں پیدا ہوئے جہاں ہوش سنبھالا بلکہ ساری عمر گذاری علوم سے یکلخت خالی، نہ وہاں علوم دینی کا پتہ نہ دنیاوی کا نشان۔ پھر اس پر ایسا دین ایسا آئین، ایسی کتاب لاجواب اور ایسی آیات بینات لائے کہ آج تک بڑے بڑے حکما، اس کا جواب نہیں لا سکے۔ بلکہ بڑے بڑے مدعیانِ عقل و تہذیب نے اس کی داد دی۔ قرآن جیسا زندہ اور علمی معجزہ کس پیغمبر کو دیا گیا جس کا مقابلہ کیا باعتبار فصاحت و بلاغت کے اور کیا باعتبار علوم و مضامین کے اور کیا باعتبار تحریف و تبدیل سے محفوظ رہنے کے دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی اور نہ انشاء اللہ تعالیٰ کر سکے گی۔

قرآن کے حق میں ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خود قرآن تیرہ سو برس سے پکار پکار کہہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ جس میں ہمت ہو وہ میرا جواب لکھ دے۔ مگر آج تک کسی کا حوصلہ نہ ہوا اور نہ ہو کہ اس کی ایک چھوٹی سی سورۃ کی مثال بھی پیش کر سکے۔

اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اپنی عادت و اخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام سے فائق تھے ایسے ہی علوم کے بھی سارے مراتب آپ پر تمام کر دیئے گئے تھے کیونکہ انبیاء سابقین میں نہ ایسا اعجاز علمی کسی کو دیا گیا، نہ اُن کے اتباع میں کسی نے ان علوم کے دریا بہائے ہیں جو اہل اسلام نے بہائے ہیں اور جب کہ صفت علم تمام ان صفات کی خاتم ہے جو مربی عالم میں ہیں تو جس کا اعجاز علمی ہوگا گویا اس پر تمام کمالات علمی کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ اور اسی کو ہمارے نزدیک خاتم الانبیاء کہنا مناسب ہوگا اور چونکہ اُس کا دین قیامت تک رہیگا اس لیے اُس کی کتاب کا بھی تا قیامت باقی رہنا ضروری ٹھہریگا

قرآن کریم کی حفاظت

پس جس طرح قرآن کی ہر ایک ادا انوکھی اور ہر ایک شان نرالی ہے، ضروری ہوا کہ اُس کی حفاظت بھی بالکل نرالے طریقہ اور نئے رنگ ڈھنگ سے ہو اور چونکہ وہ محض خدا

کی کتاب ہی نہیں بلکہ اس کا کلام معجز ہے اس لئے نہ صرف اس کے مطالب اور علوم بلکہ اس کی عبارت اور الفاظ بھی تغیر و تبدیل سے مصئون و مامون رہے بظاہر یہ ایک ایسا مشکل اور اہم اور پُر صعوبۃ مقصد تھا کہ اگر اس کا انصرام صرف ناتوان بندوں کی مرضی، ہمت، تدبیر اور انتظام کے حوالہ کر دیا جاتا اور ایک خاص قسم کی توفیق ربانی اُن کی مدد نہ کرتی تو کسی طرح اُس کا سر انجام آسان نہ تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ بندے اس کی حفاظت کی سامان مکمل کرتے خود قرآن اُتارنے والے نے بڑے مؤکد اور قطعی عنوان سے اس کا تکفل فرما لیا چنانچہ اُسی وقت جب کہ کسی انسان کو یہ یقین کر لینے کے لئے بظاہر کچھ اسباب موجود نہ تھے کہ قرآن بھی معاذ اللہ کچھ زمانہ کے بعد ویسی ہی غلط اور محرف ترجموں کی صورت میں باقی نہ رہجائیگا جس میں کہ توراۃ و انجیل موجود ہیں صاف صاف اعلان فرما دیا گیا کہ:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝ (بیشک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بیشک ہم ہی اسکے نگہبان بھی ہیں

یہ وعدۂ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز ذرائع سے پورا ہو کر رہا جسے دیکھکر بڑے بڑے متعصب اور مغرور مخالفوں کے سر بھی نیچے ہو گئے۔ جس طرح قرآن کی بے نظیر فصاحت و بلاغت کے آفتاب نے لمبے چوڑے دعوی کرنیوالوں کی آنکھیں خیرہ کر دیں اسیطرح اُس کی وعدۂ حفاظت و خدمت نے بھی ایک مرتبہ اور تاریخ کو اپنی مثال پیش کرنے سے عاجز کر دیا۔ ہر زمانہ میں ایک جم غفیر علماء کا جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے ایسا رہا کہ جس نے قرآن کی علوم و مطالب اور غیر منقضی عجائب کی حفاظت کی۔ کاتبوں نے رسم الخط کی، قاریوں نے طرز ادا کی، حافظوں نے اُس کے الفاظ اور عبارت کی وہ حفاظت کی کہ نزول قرآن کے وقت سے آج تک ایک زبر یا زیر تبدیل نہ ہو سکا۔ کسی نے قرآن کے رکوع گن لئے، کسی نے آیتیں شمار کیں، کسی نے حرفوں کی تعداد بتلائی حتے کہ بعض نے ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ کو شمار کر ڈالا۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک کوئی لمحہ اور کوئی ساعت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد

حفاظ قرآن کی موجود نہ ہو۔ جنہوں نے کاغذ کے اوراق میں نہیں جو مٹ جانے اور جل جانے کا امکان رکھتے ہیں، سیاہی کے نقوش میں نہیں جن کے محو یا مشکوک ہو سکنے کا احتمال ہے۔ لکڑی اور لوہے کے صندوقوں میں نہیں جن کے کھوئے جانے یا لوٹ جانے کا اندیشہ ہے بلکہ اپنے دلوں کے اوراق میں اور سینوں کے صندوقوں میں بڑی احتیاط اور خبرداری سے محفوظ رکھا

بَلْ هِيَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

مگر جن لوگونکو عقل دی گئی ہے اُنکے عقیدہ میں تو یہ قرآن ایسی کھلی کھلی آیتیں ہیں کہ کوئی منصف مزاج اُن سے انکار نہیں کر سکتا

خیال کرو کہ ۸-۱۰ سال کا ہندوستانی بچہ جسے اپنی مادری زبان میں دو تین جزو کا رسالہ یاد کرانا دشوار ہے وہ ایک غیر ملکی زبان کی اتنی ضخیم کتاب کو جو متشابہات سے پُر ہے کس طرح فر فر سُنا دیتا ہے۔ رمضان المبارک میں اسلامی مساجد کا وہ سین دیکھنے کے قابل ہے جب چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ننھی آواز اور معصومانہ لہجہ میں قرآن شریف سُنا کر سامعین کے دلوں کو وجد میں لے آتے ہیں۔ پھر کسی مجلس میں ایک حافظ سے کوئی حرف چھوٹ جائے یا اعراب کی فروگذاشت ہو جائے تو چاروں طرف سے تصحیح کرنیوالے للکارتے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ پڑھنے والوں کو غلطی پر قائم رہنے دیں۔

ان حالات کو سامنے رکھکر تاریخ سے دریافت کرو کہ کیا قرآن کے سوا کبھی دنیا میں کسی اور کتاب کی بھی اسقدر حفاظت اور خدمت ہوئی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ کتنا ہی بڑا نکتہ چینی کرنیوالا کیوں نہ ہو اسقدر انصاف کشی نہ کریگا کہ وہ قرآن کی اس بیمثال حفاظت میں بھی شبہہ اور تردد کرنے لگے۔

باقی ایسے سوفسطائیوں سے میرا خطاب نہیں جو محسوسات اور مشاہدات میں بھی لاادری کہنے سے دریغ نہ کریں۔

قرآن کریم کی تعلیم

قرآن کریم نے تمامی ابواب ہدایت کے متعلق جو کچھ تعلیم دی ہے اس کی پوری تفصیل

کسی انسانی بیان میں کہاں سما سکتی ہے۔ قرآنی علوم کا دریائے ناپیدا کنار کس کی مٹھی میں آسکتا ہے۔ اور کس بشر کی طاقت ہے کہ وہ اُس رب العزت کے سمندر کو ایک کوزہ میں بند کر سکے۔ لیکن قرآن کے اعجازوں میں سے شاید یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ جسقدر مشکل ہے اُسی قدر آسان بھی ہے، جتنا طویل وعریض ہے اتنا ہی مختصر بھی ہے۔ یعنی جس طرح وہ ایک بڑے سے بڑے روشن دماغ حکیم کا پیٹ حکمتوں سے بھر دیتا ہے اسی طرح ایک وحشی سے وحشی انسان کی پیاس بھی اپنے چشمہ ہدایت سے بجھا سکتا ہے میں اسوقت قرآن کے علوم ومعارف کا تھوڑا سا اندازہ کرنے کے لئے بڑے بڑے کتب خانوں اور درگاہوں کا حوالہ نہیں دیتا بلکہ ایک بہت ہی سہل طریقہ بتلاتا ہوں کہ مضامین روحانیت اور ابواب ہدایت میں سے جو مضمون اور باب چاہو لے لو اور جتنی کتابیں آسمانی ہونے کی مدعی ہیں اُن میں صرف اس ایک باب کے متعلق جو تعلیمات ہیں ہر ایک مذہب والا انتخاب کر کے پیش کردے۔ انسانی کتابوں اور آرا سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔ جو کچھ ہو آسمانی کتاب کے حوالہ سے مع اصل عبارت کے ہو۔ اور عبارت کا صحیح ترجمہ ملکی زبان میں کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ سب تحریریں کسی ایک متفق علیہ حکم کے سامنے، یا اگر یہ نہو سکے تو عام پبلک کے روبرو پیش کردی جائیں۔ بیک نگاہ سب کے سامنے آنے سے دنیا خود فیصلہ کریگی کہ کس کتاب کی تعلیم اس باب میں زیادہ جامع، زیادہ مؤثر، زیادہ مبرہن، زیادہ قابل قبول ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آسان اور بے تکلف صورت تعلیمی موازنہ کی اور کوئی نہ ہوگی۔ ع

بس ایک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

قرآن کریم میں اللہ جل شانہ کے کمالات وصفات کا بیان اور ذکر اللہ کی کثرت

مولانا مولوی فیروزالدین صاحب ڈسکوٹی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں۔

پھر ایک بڑی بھاری دلیل قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونیکی یہ ہے کہ اسمیں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کو نہایت اعلیٰ طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کلام الٰہی کا خاصہ ہے کہ اس میں خالق کائنات کی تمام صفات کاملہ بڑی شان و شوکت کیساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان اور اس کی صفات کاملہ ایسے طور پر مذکور ہوتی ہیں کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ ایسے ڈھنگ سے بیان ہوئی ہیں کہ اس خصوصیت میں دنیا کی کوئی کتاب اس کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتی، بات بات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان چمکتی ہے۔ اور اس کی الوہیت، ربوبیت، خالقیت، رحمانیت اور قدوسیت اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ سارا کلام الٰہی اسماء حسنیٰ اور صفات کاملہ رب العالمین سے بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ کا ذکر اور اس کا نام اس کثرت سے آتا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اُس کیساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ گویا قرآن شریف جا بجا خدا کا نام یاد کرنے کے لئے اک بہانہ اور موقع ڈھونڈتا ہے۔ قرآن شریف کا کوئی صفحہ اُٹھاؤ، اس کا کوئی حصہ پڑھو اس میں اللہ کا نام یا اُس کی کسی اور صفت کا ذکر ضرور پاؤ گے۔ قرآن شریف میں صرف دعائیں اور خدا کی صفات ہی نہیں بلکہ اس میں تمام معاملات دینی و دنیوی اور قوانین قومی و ملکی بھی بیان کئے گئے ہیں۔

با ایں ہمہ اس میں اللہ تعالیٰ کا نام اور اُس کے اسماء حسنیٰ جا بجا پائے جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر اور ایسے معاملات میں بھی جہاں انسان سے سخت دشوار ہے کہ اللہ کا نام لا سکے۔ قرآن میں اللہ کا لفظ ٦٦٦٦ دفعہ آیا ہے اور اُس کے باقی اسماء حسنیٰ کا کچھ شمار نہیں اور جو ضمائر اللہ تعالیٰ کیطرف پھرتی ہیں اُن کی گنتی بجز خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔

تسبیحات اور تہلیلات اور دعاؤں وغیرہ کے موقعہ پر تو اللہ تعالیٰ کا نام آہی جاتا ہے لیکن معاملات اور تعزیرات کے موقعہ پر بھی جس طرح قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا نام آیا ہے وہ صرف قرآن شریف ہی سے خصوصیت رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب اس

خصوصیت میں قرآن شریف سے مقابلہ نہیں کرسکتی۔ توریت وانجیل وغیرہ کے صفحوں کے صفحے خدا کے ذکر اور اس کے نام سے خالی ہیں۔ لیکن قرآن شریف کا کوئی صفحہ کوئی حصہ الٰہی یاد اور الٰہی نام سے خالی نہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس واقعہ اور اس معاملہ کا طرز بیان اور اسلوب ہی ایسے ڈھنگ پر ڈالا ہے کہ خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کا نام اور اُس کا ذکر کہیں بیچ میں ضرور آجاوے۔ کوئی معاملہ، کوئی واقعہ، کوئی قصہ ایسا نہیں جس میں بار بار اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ آئے۔ قرآن شریف کے پڑھنے سے نہ صرف دینی احکام اور الٰہی شریعت سے آگاہی ہوتی ہے۔ بلکہ کلام ربانی سارے کا سارا یاد الٰہی سے پُر ہے۔ صفحے اُلٹتے جاؤ اور خدا تعالیٰ کا نام بار بار پڑھتے جاؤ اور خدا تعالیٰ کا نام بار بار پاتے جاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت میں بھی کمال ثواب ہے۔ کیونکہ وہ اسماءِ حسنیٰ سے پُر اور درود اور وظیفے کی بھی ایک مقدس کتاب ہے۔ مثال کے طور پر ایک سورۂ طلاق کو لے لو۔ سورۂ طلاق کے نام سے تو مفہوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف عورتوں کے طلاق دینے کی بابت احکام و ہدایات ہونگی۔ لیکن نہیں اس میں عبرت، وعظ، تذکیر اور خدا تعالیٰ کے مقدس ناموں کا وظیفہ بھی ہے۔ چنانچہ اس چھوٹی سی سورۃ میں پچیس ۲۵ جگہ "اللہ" کا لفظ اور دو جگہ "رب" کا لفظ آیا ہے۔ اور بہت سی ضمائر خدا کیطرف پھرتی ہیں۔ باوجودیکہ اس سورۃ میں معاملہ طلاق کا ذکر ہے جس کو اگر کوئی اور شخص بیان کرتا تو شاید ایک دو جگہ بھی اللہ کا نام نہ لاتا۔"

اچھا ہر ایسی کتاب کا جو آسمانی کہی جاتی ہو کیف ما اتفق ایک ایک صفحہ ہاتھ میں اٹھا لو اور شمار کر لو کہ اس صفحہ میں خدا کا نام کتنی جگہ اور کیسی عظمت و شان سے آیا ہے۔ یہ موٹی سی بات ہے پتہ دیدیگی کہ کونسی کتاب آسمانی ہے جو کسی معاملہ میں ذرا سی دیر کے لئے اپنے پڑھنے والے کو خدا کی یاد سے غافل نہیں رہنے دیتی اور جو اس کا امکان بھی نہیں چھوڑتی کہ ہزارہا سال تک کروڑوں انسان اگنی وغیرہ الفاظ سے جو بقول سوامی دیانند پرمیشور کے نام تھے، آگ اور دوسرے عناصر وغیرہ سمجھکر خدا کی جگہ ان ہی چیزوں کی عبادت (پوجا) کریں

قرآن کریم کی بینظیر سلاست اور روانی

مولانا فیروز الدین فرماتے ہیں "پھر ایک دلیل قرآن شریف کے کلام ربانی ہونیکی اُس کی وہ لاثانی بندش اور بینظیر روانی ہے جس پر آج تک ایک دنیا شیدا ہے۔ کوئی عربی عبارت پڑھو اس کی بندش اور روانی معمولی قسم کی ہوگی۔ لیکن قرآن شریف کی روانی اور سلاست اس قسم کی ہے کہ جو لوگ معنے نہیں جانتے، جو لوگ عربی سے کچھ مس نہیں رکھتے وہ بھی اس کی روانی اور سلاست کو دیکھ کر شیفتہ اور حیران ہیں۔ خوش آواز قاری جب قرآن شریف کو ایک لحن مرغوب اور اسلوب خوش سے پڑھتا ہے تو دلوں میں زلزلہ اور روحوں میں ولولہ ڈالدیتا ہے۔ عام قاری وحافظ جب قرآن شریف کو ایک جوش کیساتھ پڑھتے ہیں توکسقدر اثر لوگوں کے قلب پر ہوتا ہے۔ دنیا کے سردار حضرت رسول کریم صلعم جب اس کلام پاک کو پڑھتے ہوں تو سننے والوں کے دلوں پر کیا کچھ اثر پہنچتا ہوگا۔ کلام الٰہی کے الفاظ واقعات کی زندہ تصویریں معلوم ہوتی ہوں گی جو سننے والے کے پیش نظر ہیں۔ کس شخص کی طاقت ہے کہ قرآن شریف کی سلاست اور روانی کی بابت کچھ بیان کر سکے۔ وہ ایک وجدانی امر ہے اور وجدانیات کی لذت کو بجز چکھنے کے کس کو یارا ہے کہ معرض تحریر یا تقریر میں لا سکے۔ قرآن شریف کی عبارت پر جیسے پڑھے ہوئے مفتون ہیں ویسے ہی اَن پڑھ عاشق ہیں یہی عبارت کی روانی اور دلوں پر عجیب اثر ڈالنے والی جادو بیانی کفار عرب کو اس بات کے کہنے پر مجبور کرتی تھی کہ:۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝	یہ (قرآن) تو بس (ایک قسم کا) جادو ہی جو اگلوں سی چلا آتا ہے اور بس تو کیا تم دیدہ و دانستہ جادو کی باتیں سننے کو آتے ہو۔

تمام آسمانی کتابوں کے مدعی اسی طرح موازنہ کر لیں کہ ہر کتاب کی تھوڑی سی عبارت جس طرح پڑھی جاتی ہے کسی اچھے صحیح اور صاف پڑھنے والے سے مجلس میں

پڑھوا کر دیکھیں خود معلوم ہو جائیگا کہ قلوب کس سے زیادہ لذت اور اثر حاصل کرتے ہیں۔

قرآن کریم عام اشعار کیطرح کلام منظوم نہیں لیکن اُس نے نظم کی روح نکالکر نثر میں ڈالدی ہے۔ ایک بالکل ہی اچھوتا اسلوب عام نثر اور نظم کے درمیان اختیار کیا ہے۔ کہ شاعر اور خطیب دونوں کی روحیں سو جان سے اس کی لطافت اور شوکت پر قربان ہوتی ہیں۔

قرآن کی ان حسنی اور معنوی خوبیوں کو دیکھ کر بیساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ

بہارِ عالمِ حسنش دل وجاں تازہ میدارد | برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

قرآن میں ایک مضمون دوسرے سے مغلوب نہیں ہوتا

انسان چونکہ مخلوق ہے اور کمزور مخلوق ہے اس لئے جب اس پر کوئی حالت طاری ہوتی ہے تو اُس کے مقابل والی حالت مضمحل اور مغلوب ہو جاتی ہے۔ بڑے سے بڑا قادر الکلام لیکچرار جب غصہ میں بھرا ہوا مضمون بیان کرتا ہے تو عین اُسی وقت ملاطفت اور مہربانی کی تقریر ویسے زور سے نہیں کرسکتا۔ اسیطرح شفقت و رحمت کیساتھ اگر غضب و سخط کی بھی ضرورت ہو تو دونوں کا مساویانہ توازن قائم رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ صرف خداوند اکبر ہی کی ذات کا خاصہ ہے جس کی ایک صفت دوسری صفت کے لئے مزاحم نہیں ہوتی۔ اور جس کو ایک شان دوسری شان سے مشغول نہیں کرسکتی کہ وہ ہر وقت و ہر آن تمامی متقابل صفات کیساتھ متصف ہے۔ اسی لئے جب اُس کے کلام کو ہم پڑھتے ہیں تو رحمت کیساتھ غضب، وعدہ کیساتھ وعید، تبشیر کیساتھ انذار اور خوف کیساتھ رجا ترازو کے دو پلوں کی طرح ہمیں برابر نظر آتے ہیں۔ جنمیں سے کوئی بھی دوسرے سے جھکا نہ ہو۔ عین غصہ کیوقت پیار اور پیار کیساتھ غصہ اسطرح کہ ایک کا بیان دوسرے سے وزن میں گھٹنے نہ پائے یہ صرف اُسی رب العالمین کے کلام میں دیکھا گیا ہے۔

قرآن میں غیبی خبریں

قرآن کے مضامین کے متعلق ایک اور ضروری چیز بیان کرنے سے رہ گئی اور وہ امم ماضیہ اور سنین گذشتہ کی ایسی مفصل اور درست خبریں اور واقعات مستقبلہ کے متعلق اس کی متعدد پیش گوئیاں ہیں جو حرف بحرف صحیح ثابت ہو چکیں۔ یہ نہیں کہ کاہنوں اور نجوموں کے اٹکل پچو بیانات کی طرح سو میں ایک دو دفعہ تیر نشانہ پر جا لگا بلکہ قرآن نے جن واقعات کی خبر دی وہ صبح صادق کی روشنی کی طرح نور افزائی دیدہ بصیرت ہوئے۔ مثال کے طور پر آپ اس آیت کو لے لیجئے۔

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ۔

قریب کے ملک (یعنی فارس) میں رومی (جو نصاری ہیں اہل فارس سے جو آتش پرست ہیں) مغلوب ہو گئے ہیں لیکن وہ اپنے مغلوب ہونے کے پیچھے عنقریب چند سال میں (پھر اہل فارس پر) غالب آجائیں گے۔

عجم پر روم کے غلبہ کے متعلق جو خبر جتنے زمانہ کی ساتھ مقید کر کے اس آیت میں دی گئی تھی وہ بلا کم و کاست پوری ہوئی۔ اگر آپ قرآن کی پیشین گوئیوں کے متعلق مفصل دیکھنا چاہتے ہیں تو علماء نے اس باب میں مستقل رسالے لکھے ہیں ان کو مطالعہ کیجئے۔ میں نے تو صرف ایک نمونہ دکھلا دیا ہے۔ اخبار ماضیہ میں بعض کور چشم یہ کہہ دیتے ہیں کہ شاید آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پوچھ کر درج کر دیئے ہوں گے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ خود امی تھے، آپ کی قوم امی تھی۔ مادری زبان عربی کے سوا کوئی دوسری زبان آپ نے سیکھی نہیں تھی۔ کسی عالم کی ملازمت و صحبت کا آپ کو موقع نہیں ملا جو اسقدر مفصل و مستند واقعات اخذ کر سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ جن کے پیش نظر آپ کی زندگی کے تمام اطوار و ادوار تھے اور پھر ہر وقت

ایسی چیزوں کا کھوج لگانے میں سرگرم تھے جو آپ کی تکذیب کا ذریعہ بنیں تیئیس۲۳ سال کی طویل مدت میں سب سے پہلے ایسی شہادتیں بہم پہنچا کر شائع کر دیتے۔ شاید اسی لئے قرآن کریم نے ایسے غیر ناشی عن الدلیل احتمالات کا رد کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ صرف اسقدر تنبیہ کر دی کہ نبی امی صلعم پچھلے واقعات بن دیکھے بیان کر رہے ہیں وہ اس کے سوا نہیں کہ وحی الٰہی نے اُن کو معلوم کرائے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا۔

(اے پیغمبرؐ) یہ غیب کی چند خبریں ہیں جن کو وحی کے ذریعہ سے ہم تم کو پہنچاتے ہیں اس (قرآن کے نازل ہونے) سے پہلے نہ تو تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم کے لوگ۔

اور فرماتے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

اور (اے پیغمبرؐ) جسوقت ہم نے موسیٰؑ کو (رسالت کے) اختیارات دیے تو تم (طور کے) مغربی جانب (جہاں موسیٰؑ کو رسالت ملی تھی موجود) نہ تھے اور نہ تم (اس واقعہ کے) چشم دید دیکھنے والوں میں تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہم نے بہت سی امتیں نکال کھڑی کیں اور ان پر بہت سے قرن گذر گئے اور نہ تم مدین کے لوگوں میں رہے کہ تم ان کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے تھے (اور یوں تم کو اسوقت کے حالات معلوم کرنیکا موقعہ ملا ہو) بلکہ ہم کو (تمہیں پیغمبر بنا کر) بھیجنا منظور تھا اور نہ اُسوقت کہ ہم نے (موسیٰ کو) بلایا تھا تم طور کے (کسی) طرف موجود تھے (کہ تم نے وہ واقعات بچشم خود دیکھے ہوں) بلکہ (یہ تمہارے) پروردگار کی (ایک) مہربانی ہے تاکہ تم ان لوگوں کو ڈراؤ جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانیوالا نہیں آیا۔ عجب نہیں (تمہارے ڈرانے سے) یہ لوگ نصیحت پکڑیں۔

اور فرماتے ہیں۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

(اے پیغمبرؐ) یہ چند غیب کی باتیں ہیں جن کو ہم وحی کے ذریعے تمہیں معلوم کراتے ہیں (اور یہ تمہاری صداقت کی دلیل ہے) ورنہ جسوقت یوسف کے بھائیوں نے اپنا مصمم ارادہ کرلیا تھا (کہ یوسف

إِذْ أَجْمَعُوٓا۟ أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ۝

کو کنویں میں ڈالدیں) اور وہ اُن کے ہلاکت کی) تدبیر کر رہے تھے تم تو اُن کے پاس موجود نہ تھے کہ یہ حالات تم کو بطور خود معلوم ہو جاتے)۔

اچھا واقعات گذشتہ میں آپ کے یہ احتمالات سہی لیکن مستقبل کے متعلق جو بکثرت خبریں دی گئیں اور ایک کی بھی کوئی تکذیب نہ کرسکا نہیں بجز اس کے کہ اُس عالم الغیب والشہادہ کیطرف نسبت کیا جائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

خاتمہ کلام

میں اپنی تقریر اب ختم کرتا ہوں اور قرآن کریم کی تین بہت ہی چھوٹی سورتیں (العصر الکوثر۔ الاخلاص) کو پیش کر کے جو اخیر پارہ میں ہیں تمام مذاہب کو چیلنج دیتا ہوں کہ ان سورتوں میں سے کسی ایک کے مقابلہ میں کوئی پُرانا یا نیا کلام سب ملکر لے آئیں جس میں ایسے مختصر اور جامع الفاظ میں اس طرح کے مضمون کو اسی قدر خوبی اور لطائف و مزایا کی رعایت کیساتھ ادا کیا گیا ہو جتنا کہ ہم اہل اسلام بحول اللہ وقوتہ بوقت مقابلہ ہر دو کلام قرآن کریم کی اس سورۃ کی عبارت اور اُسلوب میں بتلا سکتے ہیں۔ اور اس کام کے لئے جتنی مدت اور مہلت معارضہ کرنے والے چاہیں وہ دی جا سکتی ہے اور ہر ایک معقول شرط منظور کی جا سکتی ہے۔ لیجئے ساری بحثیں اور سارے مناظرے صرف ایک ذرا سی بات پر تمام ہوتے ہیں۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ وَلَن تَفْعَلُوا۟ فَٱتَّقُوا۟ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى وَقُودُهَا ٱلنَّاسُ وَٱلْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَٰفِرِينَ ۝

اس پر بھی اگر تم ایسا نہ کرسکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو تم کو ڈرنا چاہئے اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی ہیں اور پتھر جو تیار کیگئی ہے منکروں کے لئے۔

خاتمہ مضمون پر میں یہ کہدینا چاہتا ہوں کہ میں نے اس تقریر میں صرف یہ کوشش کی ہے کہ ایک صاف اور سلیس اور معقول طریقہ سے قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونا واضح

کر دیا جائے۔ مضمون کے دوسرے حصص جو شاید اس کے بعد شائع ہو سکیں اُن میں تفصیلاً بتلایا جائے گا کہ قرآن کریم کے متعلق مخالفین اسلام نے کیا کیا شکوک و شبہات پیش کیے ہیں اور ان کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ مبلغین اور مناظرین اسلام اور طالبین حق و صدق کے لئے نافع ہوگا۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ

توکلت والیہ انیب

الراقم

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

دار العلوم دیوبند۔ ۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ

فہرست کتب مصنفہ حضرت امام المفسرین والمتکلمین

عالیجناب مولانا شبیر احمد عثمانی مدظلہ العالی

اعجاز القرآن۔ جس میں معجزہ اسکی حقیقت۔ اوس کے مدارج۔ وحی آلہی کی ضرورت اور اس کے مراتب بیان کرنیکے بعد قرآن کریم کا معجزہ اور کلام ربانی اور وحی الٰہی ہونا نہایت پُرعظمت تفصیل اور سانی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ ۸ر

العقل والنقل۔ جسمیں مستند حوالوں اور محققانہ مباحث کے بعد ثابت کیا گیا ہے کہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہوسکتا اور یہ کہ کبھی عقل سلامتی یا نقل کی صحت میں قصور ہونیکی وجہ سے ایسا پیش آئے تو اس وقت اس کا فیصلہ کسطرح ہونا چاہئے۔ ضمنی طور پر بڑی بڑے مشاہیر اور اکابر محققین کے نہایت معرکۃ الآراء تقریریں درج کی گئی ہیں جو اصول اسلام کے سمجھنے میں بہت بصیرت پیدا کرنیوالی ہیں قیمت ۱۰ر

الاسلام اس کتاب میں اسلام کے اکثر اصول کلیہ کو ایک موثر اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اگر دنیا میں کوئی مذہب عقل سلیم اور فطرۃ صحیحہ کے موافق ہے تو وہ تنہا ایک مذہب اسلام ہے۔ وجود باری۔ توحید حدوث مادہ۔ نبوۃ۔ ختم نبوۃ۔ معجزات۔ اور وجود ملائکہ و شیاطین وغیرہ وغیرہ مضامین نہایت ہی شرح وبسط سے لکھے گئے ہیں قیمت ۶ر

ہدیہ سنیہ۔ جس میں دار العلوم کے ایک فیضیافتہ کے دو شبہوں کا جو وحدۃ وتعدد حق اور نعماء جنت کے جسمانی ہونیکے متعلق ہیں نہایت محققانہ جواب تحریر فرمایا ہے حضرت ممدوح نے یہ جواب جس تحقیق اور جدت سے تحریر فرمایا ہے وہ نہایت مفید اور حقائق علمیہ سے معمور ہونے کے باوجود حسن بیان میں بھی اپنی نظیر آپ ہے قیمت ۲ر

تحقیق الخطبہ۔ جس میں خطبہ جمعہ کو زبان اردو و فارسی میں پڑھنے کی تحقیق کی گئی ہے۔ قیمت فی نسخہ ۱۰ر

الشہاب لرجم الخاطف المرتاب۔ جس میں نہایت سلیس معقول اور منصفانہ طریقہ سے مرزائیوں

ارتداد کا ثبوت قتل مرتد کے شرعی د[illegible] اور اس کا فلسفہ اور جہاد بالسیف کی حکمت اور حدود اور دولت مستقلہ خداداد افغانستان کے فیصلہ درباره تعزیر مرتد کی تحسین وتصویب اور ان تمام [illegible] کا [illegible] کیا گیا ہے جو اس فیصلہ پر کئے جا رہے ہیں۔ اس رسالہ کو مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہو جائیگا کہ محمد علی صاحب [illegible] جماعت قادیانی لاہور کے اس پمفلٹ کو جو پیغام صلح کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوا جس میں گورنمنٹ افغانستان اور علماء دیوبند کے خلاف نفرت اور اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے [illegible] ایک انصاف پسند مسلم ہستی کی نظر کس درجہ اعتبار اور وقعت سے دیکھ سکتی ہے [illegible]

الجہاد الکبیر [illegible]۔ جس میں ان اعتراضات کے دندان شکن تحقیقی اور الزامی جواب تفصیل کے ساتھ دیئے گئے ہیں جو سوامی جی نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر کئے تھے قیمت ۲/

سلسلة الجہاد الکبیر حصہ ۲ اس میں مسئلہ جہاد کی پوری تحقیق کی گئی ہے اور جہاد کی اقسام دفاعی و ہجومی کو عقل سلیم اور نقل صحیح سے ثابت کیا گیا ہے۔ (زیر طبع ہے)

ملنے کا پتہ

(مولوی) **محمد یحییٰ معین المدرسین دار العلوم دیوبند** (ضلع سہارنپور)

حضرت محمد عبد المنان عفا اللہ عنہ کتب خانہ نوریہ
بالمقابل جنوبی دروازہ جامع مسجد دہلی